پروگریسیو پبلشرز
ویلدار پارک اچھرہ۔ لاہور۔ ۱۶

آج کا سندھ

محمود مرزا

فہرست

پیش لفظ

پہلی رپورٹ

۱۔ تحریکِ سول نافرمانی اور دیہی سندھ۔ ۷
۲۔ شکایات کا پس منظر۔ ۱۰
۳۔ مسلم قوم سے سندھی قومیت تک کا سفر۔ ۲۳
۴۔ سندھ کے لسانی گروہ۔ ۲۸
۵۔ مسائل کا حل۔ چند تجاویز۔ ۳۸

دوسری رپورٹ

۶۔ ابتدائی کلمات۔ ۵۱
۷۔ علاقائی پسماندگی اور قومی مالیات۔ ۵۹
۸۔ سندھ کے اُبھرتے فکری رجحانات۔ ۶۹
۹۔ کُل پاکستان سطح کی سیاسی قوتیں۔ ۷۸
۱۰۔ صوبائی حقوق اور جمہوری استحکام۔ ۸۹

ضمیمہ جات

۱۱۔ آل انڈیا مسلم لیگ کی قرارداد لاہور ۱۹۴۰ء۔
۱۲۔ مسلم لیگ کی مجالس قانون ساز کے اراکین کی کنونشن کی قرارداد دہلی ۱۹۴۶ء۔
۱۳۔ سندھ صوبائی مسلم لیگ کانفرنس کی قرارداد کراچی۔ ۱۹۳۸ء۔
۱۴۔ ایم۔ آر۔ ڈی کا اعلانیہ۔
۱۵۔ بیلیجو لاہور میں۔

پیش لفظ

نو سیاسی جماعتوں پر مشتمل اتحاد "تحریک بحالیٔ جمہوریت" (ایم۔آر۔ڈی) نے جولائی ۱۹۸۳ء کے اوائل میں اعلان کیا کہ وہ آئندہ یوم آزادی سے سول نافرمانی کی تحریک شروع کرے گی۔ ۱۴ اگست ۱۹۸۳ء سے شروع ہونے والی اِس تحریک نے سندھ میں ابتدائی ایام ہی میں دوسرے صوبوں سے مختلف رنگ اختیار کیا۔ سندھ کے بارے میں یہ باور کیا جاتا ہے کہ یہ میٹھا بولنے والی نرم خُو لوگوں کی سرزمین ہے۔ اِس پس منظر میں وہی سندھ میں عام شہریوں اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کے درمیان فائرنگ کا تبادلہ اور دونوں اطراف سے متعدد افراد کا جاں بحق ہونا ایسے معاملات تھے جنہوں نے پاکستان کے ہر شہری کو دُکھ اور حیرت میں مبتلا کر دیا۔ اُنہی دنوں بھارت کے دارالحکومت میں بین الاقوامی سندھ سمیلن کا انعقاد ہوا۔ جس میں بھارت کے صدر اور وزیراعظم شامل ہوئے۔ اِس میں اندرا کانگریس کے رہنماؤں نے تقاریر کیں کہ سندھ کو قوت کے زور سے بھارت میں ضم کر لیا جائے یہ سب واقعات ایسے تھے جنہوں نے ملک بھر میں ایک تشویش کی لہر پھیلا دی۔

حیرت اور تشویش اِس لئے بھی زیادہ تھی کہ مسلمانان سندھ نے پاکستان کے قیام کی جدوجہد میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ جب پاکستان معرض وجود میں آیا اُس وقت بنگال کے علاوہ صرف سندھ ہی وہ صوبہ تھا جہاں مسلم لیگ کی وزارت قائم تھی۔ سندھ میں جس قسم کے واقعات وسط اگست تا وسط اکتوبر ۱۹۸۳ء رونما ہوئے اُن کے بارے میں کسی کو گمان تک نہ تھا۔

اسی ماحول میں میں نے اور ملک امجد حسین صاحب ایڈووکیٹ نے مل کر "اہل پنجاب کی ذمہ داری" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا۔ میں نے یہ عہد بھی کیا کہ سندھ کے اندرونی حالات کا بنظر غائر خود جائزہ لوں گا۔

اس سلسلے میں سندھ کا پہلا دورہ میں نے ۲ نومبر ۱۹۸۳ء سے ۱۰ نومبر ۱۹۸۳ء کے دوران کیا۔ اس دورے میں پروفیسر سید فاروق حسنات بھی میرے ہمسفر تھے۔ دوسرا دورہ میں نے ۵ جولائی تا ۱۵ جولائی ۱۹۸۴ء کے دوران کیا۔ اس دورے میں دو اخبار نویس جناب ثناء اللہ اور جناب محمد موسیٰ بھٹو میرے شریک سفر رہے اور تیسرا دورہ ۲۲ دسمبر تا ۳۱ دسمبر ۱۹۸۴ء کے دوران کیا جس میں جناب ملک امجد حسین ایڈووکیٹ کچھ مدت میرے شریک سفر رہے۔

ان دوروں میں ہم کراچی، حیدرآباد، ہالہ، سکرنڈ، مورو، قاضی احمد، دادو، خیرپور ناتھن شاہ، لاڑکانہ، سیہون شریف، سن، ٹھٹھہ، سکھر، خیرپور میرس گئے۔ ہم نے خاص و عام اور متعدد مکتبہ فکر کے لوگوں سے ملاقاتیں کیں۔ اُن سے سول نافرمانی کے پس منظر پہ باتیں ہوئیں۔ سندھ کی شکایات کی طویل داستان سُنی۔ موجود صورت حال کا جائزہ لیا اور مستقبل کے امکانات پر غور کیا جن نامور اصحاب الرائے مفکرین یا راہنماؤں سے ہماری ملاقاتیں ہوئیں اُن میں سے چند ایک نام یہ ہیں۔

سید غلام مصطفیٰ شاہ، ڈاکٹر حمیدہ کھوڑو، جناب پی کے شاہانی، جناب علی احمد بروہی، جناب دریا خاں کھوسو محترمہ مہتاب اکبر راشدی، جناب عبدالقادر جونیجو، پروفیسر ڈاکٹر قمر واحد، میر مراد علی خاں تالپور، جناب مخدوم شفیق الزمان، جناب محمود پاشا کھوڑو، جناب جان محمد عباسی، جناب سوبھو گیان چندانی، جناب محمد ابراہیم جویو، جناب جی ایم سید، جناب شاہ احمد نورانی، سید حسین ہاشمی، ڈاکٹر سلیمان شیخ، جناب غلام مصطفیٰ جتوئی پروفیسر اقبال احمد خاں، جناب محمود الحق عثمانی، جناب سبط حسن، جناب اقبال حیدر، ڈاکٹر تنویر عباسی، سردار امتیاز حسین پھلپھوٹہ، پروفیسر غفور احمد، میر عطا حسین تالپور، آغا غلام نبی پٹھان، ڈاکٹر اختر حمید خاں اور حسین بخش ناریجو

ہم چند معززہ اور باثر وکلاء اور صحافیوں سے بھی ملے۔

عبدالحلیم پیرزادہ، آغا سیف الدین بابر، محمد صدیق کھرل (سکھر) جام کرار الدین، جناب عثمان علی جویو، جناب جان محمد عطار (مورو)، جناب غلام نبی سومرو (دادو)، جناب خالد اقبال میمن (لاڑکانہ) قاضی عبدالمجید عابد (عبرت حیدرآباد)، جناب ایم آر صدیقی (جنگ ٹھٹھہ)، جناب سجاد اختر (پاکستان اکانومسٹ کراچی)، جناب عبدالکریم عابد (جسارت کراچی)، جناب اختر جعفری (جنگ سکھر)، جناب محمد علی خالد (نوائے وقت حیدرآباد)، جناب مختار عاقل (جنگ حیدرآباد)، جناب نثار چنا۔ جناب ناز سہتو (آفتاب حیدرآباد)، جناب علی حسن (سٹار حیدرآباد)، جناب ادریس بختیار (سٹار کراچی)، جناب غازی صلاح الدین (ڈان کراچی)، جناب سہیل سانگی (آفتاب حیدرآباد)، جناب ظفر عباس (سٹار کراچی)، جناب سجاد میر (نوائے وقت کراچی)۔

ان حضرات سے سندھ کے حالیہ واقعات اور دیرینہ مسائل پر ان کا نکتہ نگاہ سننے کا موقع ملا۔ اندرون سندھ اُردو اور انگریزی اخبارات کے نمائندوں کی اکثریت اردو بولنے والوں پر مشتمل تھی۔ جو عام طور پر اگست ۱۹۸۳ء کی ایجی ٹیشن اور ایم آر ڈی کے مشروط یا غیر مشروط مخالف تھے۔ ان سے غیر سندھی زبان بولنے والوں کے موقف کا اندازہ ہوتا رہا۔

اِن دوروں کے دوران میں اور میرے ساتھی متعدد تاجروں سیاسی و سماجی کارکنوں سے ملے۔ ہم نے سڑک پر چلتے ہوئے عام راہگیروں سے باتیں کیں۔ کھیتوں میں کسانوں سے ملے، تمام لسانی گروہوں کے عام اور خاص لوگوں سے تبادلہ خیال کیا اور اُن کا نقطہ نظر سنا۔ ہم نے کچھ مطبوعہ لٹریچر بھی حاصل کیا اور سندھی لٹریچر کا اُردو میں ترجمہ کرایا۔

میں نے پہلی رپورٹ کا مسودہ دسمبر ۱۹۸۳ء کے اواخر میں لکھا۔ جو جنوری ۱۹۸۴ء میں روزنامہ جنگ میں بالاقساط شائع ہوا۔ دسمبر ۱۹۸۴ء میں اُس پر نظرثانی کی اور اُس میں کچھ اضافے کئے۔ یہ ترمیم شدہ رپورٹ زیرِ نظر کتاب کا پہلا حصہ ہے۔ اس رپورٹ میں میں نے تحریک بحالیٔ جمہوریت کی ہیئت اور اُس کے مطالبات پر بحث نہیں کی اور نہ ہی حکومت کے موقف پر کوئی رائے زنی کی ہے۔ اِس رپورٹ کا خصوصی مقصد یہ جاننا ہے کہ ایم آر ڈی کی جاری کردہ تحریک میں دیہی سندھ نے ہی کیوں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ سندھی بولنے والے اپنی شکایت کیا بیان کرتے ہیں۔ سندھ کے مخصوص مسائل کیا ہیں۔ سندھ کے لسانی گروہوں کی سوچ کیا ہے اور اُن کا رویہ مرکزی حکومت اور پنجاب کی جانب کیسا ہے۔ سندھ کے معاشی طبقات اور سیاسی گروہ کون کون سے ہیں اور وہ قوم کے مستقبل، ۱۹۷۳ء کے آئین اور صوبائی خود مختاری کے معاملات کے بارے میں کس سوچ کی جانب بڑھ رہے ہیں۔

یہ رپورٹ شائع ہونے کے بعد میں نے سندھ کی سیاست اور قومیت کے مسائل پر مزید غور کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسی سلسلے میں میں نے دو مزید دورے کئے۔ جن کے دوران میں نے علاقائی پسماندگی، سندھ کے فکری رجحانات، سیاسی قوتوں، صوبائی خود مختاری اور جمہوری استحکام کے مسائل کا جائزہ لیا اور چند ہفتے سوچ بچار کے بعد اِن موضوعات پر چار مضمون لکھے۔ اسی دوران غیر جماعتی بنیادوں پر انتخابات منعقد ہوئے اور قومی سیاست میں کچھ تبدیلیاں آنے لگیں۔ جنہیں دیکھ کر میں نے اِن مضامین کی اشاعت ملتوی کرنے کا فیصلہ کر لیا تاکہ سیاسی صورت حال واضح ہو جائے۔ اِس دوران مزید تین بار سندھ گیا اور کئی مزید سیاسی رہنماؤں اور دانشوروں سے ملا۔ جن میں سید محمد تقی، پیر علی محمد راشدی، پروفیسر عبدالخالق کنڈ کوٹ، جناب نور محمد پٹھان، جناب امداد محمد شاہ، جناب افضل مہین۔ جناب عابد زبیری اور مخدوم خلیق الزمان قابلِ ذکر ہیں۔ مئی ۱۹۸۶ء میں ان تجزیاتی مضامین کی نظرثانی مکمل ہوئی۔

اوّلین رپورٹ اور مذکورہ تجزیاتی مضامین پر مشتمل دوسری رپورٹ نظرِ قارئین ہے۔ اِس کتاب کے مطالعہ سے قارئین کو یہ اندازہ ہو جائے گا کہ سندھ کے بڑے بڑے مسائل کیا ہیں اور سندھی زبان بولنے والے آئین، سیاسی اور معاشی مسائل کے بارے میں کس انداز سے سوچتے ہیں۔ اپنی استطاعت کے مطابق میں نے اِن مسائل کے حل کے بارے میں کچھ تجاویز بھی پیش کی ہیں۔ اِس تمام کاوش کا مقصد یہ ہے کہ قوم میں یکجہتی اور اتحاد کو فروغ ملے۔ اب یہ معاملہ قارئین کے طے کرنے کا ہے کہ اِس کتاب نے یکجہتی کے مسائل کی فہم کے بارے میں کیا خدمت ادا کی ہے۔

آخر میں میں جناب پی کے شاہانی، حافظ محمد موسیٰ بھٹو اور جناب ثناء اللہ کا خصوصی شکریہ ادا کرنا چاہوں گا کہ اُنہوں نے سندھ کے دوروں میں میری بڑی مدد کی اور اُن کو ممکن اور کامیاب بنانے کے لئے

بعض انتظامات بھی کیئے۔ اِن تینوں حضرات نے مجھے بہت سا متعلقہ لٹریچر بہم پہنچایا جس سے میں نے خاطر خواہ استفادہ کیا۔ مضامین لکھنے میں مجھے لاہور کے جناب ملک محمد اسلم اور جناب منور شہزاد سے بڑی مدد ملی۔ اشاعت کا بوجھ جناب رضا مہدی نے اپنے ذمہ لے کر ایک بڑا مسئلہ حل کر دیا۔ میں ان سب حضرات کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔

اس کتاب کے مسودے کے بہت سے حصے جناب ملک امجد حسین، جناب ملک وزیر علی، جناب ڈاکٹر مبشر حسن، میاں ممتاز دولتانہ جناب حسین نقی اور جناب محمد ابراہیم جویو نے پڑھے اور مجھے اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا۔ جس کے لئے میں اُن سب سیاسی مفکرین کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ اِن حضرات اور بالخصوص جناب جویو نے کچھ حصّوں سے اختلاف بھی کیا۔ تاکیداً یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ اِن دونوں رپورٹوں میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کی تمام تر ذمہ داری راقم پر عائد ہوتی ہے۔ اور یہ سب حضرات اِس کتاب کے مندرجات کے پابند نہیں۔

۲۹ مئی ۱۹۸۶ء

محمود مرزا

پہلی رپورٹ

تحریکِ سول نافرمانی اور دیہی سندھ

سب سے پہلے ہم یہ جائزہ لیں گے کہ دیہی سندھ میں سول نافرمانی کی تحریک مقابلتاً زیادہ پُرزور کیوں تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ تحریک ایک صوبے تک محدود نہ تھی۔ ایم آر ڈی کی متعدد سیاسی جماعتوں اور راہنماؤں کا اثر کم و بیش تمام صوبوں اور لسانی گروہوں میں پایا جاتا ہے۔ اس تحریک کا بیان کردہ مقصد فوجی حکومت کی جگہ ۱۹۷۳ء کے آئین کا نفاذ اور اس آئین کے مطابق منتخبہ نمائندہ حکومت کا قیام تھا۔ یہ مقصد ہر صوبے ہر علاقے اور پاکستانی شہریوں کی بھاری اکثریت کو یکساں عزیز تھا۔ مگر تحریک کا زور ہر جگہ یکساں نہ تھا۔ حتیٰ کہ سندھ میں بھی بڑے شہروں کی بجائے دیہی علاقوں میں زیادہ تھا۔ پاکستان میں متعدد بار تحریکیں چل چکی ہیں، مگر سابقہ تحریکیں تمام تر بڑے شہروں سے شروع ہوئیں اور عام طور پر وہیں تک محدود رہیں۔ لیکن ۱۴ اگست ۱۹۸۳ء کو شروع ہونے والی تحریک کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ سندھ کے دیہی علاقوں میں زیادہ زور سے چلی۔ سندھ کے بڑے شہروں میں دوسرے صوبوں کے بڑے شہروں کی طرح سوائے چند ایک واقعات کے تحریک پُرامن رہی۔ لیکن سندھ کے دیہی علاقوں میں امن قائم نہ رہ سکا اور متعدد قیمتی جانوں کا ضیاع ہوا۔ اِس سے اس ایجی ٹیشن کی بنیادی خصوصیت ظاہر ہو جاتی ہے کہ اس تحریک میں پُرزور حصّہ لینے والے افراد کا تعلق سندھی زبان بولنے والی آبادی سے تھا جس کی بھاری اکثریت دیہی علاقوں میں بستی ہے۔ تحریک کی نوعیت کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے یہ خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ ہر معاشرے کا اندازِ احتجاج الگ ہوتا ہے۔ عام طور پر صرف شہروں کے لوگ عدم تشدّد کی شرط پر عمل کر سکتے ہیں۔ یہ لوگ جلسے جلوس سے اپنے جذبات کا اظہار کر لیتے ہیں۔ قبائلی لوگ شہریوں کی طرح جلسہ نہیں کرتے اور نہ ہی شہریوں کی طرح جلوس نکالتے ہیں۔ اُن کے کندھے پر بندوق اور لاٹھی ہوتی ہے۔ اور اُن کا احتجاج بھی اُنہی کے ذریعے ہوتا ہے۔ دیہی علاقوں کی نیم قبائلی طرزِ زندگی کے عادی لوگ جب احتجاج پر اُتر آتے ہیں تو توڑ پھوڑ، آتش زنی اور مار پیٹ کا وقوع فطری عمل ہے۔ خیال رہے کہ دیہی علاقوں میں وسیع پیمانے پر احتجاج شاذ و نادر

ہی ہوتا ہے اور ہوتا تب ہے جب تکلیف نہ صرف شدید ہو بلکہ دیرینہ بھی ہو۔ شہریوں کے جلوس اور قرار دادیں کسانوں کی توڑ پھوڑ اور قبائیلوں کی گولیاں بنیادی طور سے اُن کے اپنے پس منظر کے مطابق احتجاج کا مظہر ہوتی ہیں۔ لیکن سیاسی اور اخباری سطح پر احتجاج کے پیمانوں کا تصور مختلف ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں گولی چلے وہاں ایسے احتجاج کو زیادہ سنگین کہا جاتا ہے۔

فوری وجوہات

پنجاب میں بعض حلقوں کی طرف سے یہ تاثر دیا گیا کہ اِس تحریک کو چلانے والے سندھی وڈیرے ہیں۔ جن کے اشارے پر ہاریوں نے ایجی ٹیشن میں بھرپور کردار ادا کیا۔ اِس سے تو یہ خیال اُبھرتا ہے کہ گویا سندھی عوام میں تو کوئی اپنا سیاسی شعور ہے اور نہ ہی اُن کے کوئی مسائل ہیں۔ گویا وہ محض وڈیروں کے اشارے پر ناچتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ اپنی جانوں کو خطرے میں ڈالنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ یہ تاثر افسوسناک ہے۔ بعد ازاں بحث سے ظاہر ہو جائے گا کہ یہ تاثر سراسر غلط اور گمراہ کن ہے۔ البتہ اتنی بات صحیح ہے کہ ایجی ٹیشن شروع کرنے کا اعلان کرنے والوں میں سندھی وڈیرے شامل تھے۔ لیکن یہ بات یکسر غلط ہے کہ سندھی عوام کی کوئی شکایات یا مطالبات ہی نہ تھے۔

اب ہم تحریک کی فوری وجوہات کا ذکر کریں گے۔ سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ دراصل سندھی عوام کی شکایات ایک طرف لسانی اور تہذیبی ہیں اور دوسری طرف معاشی اور سیاسی نوعیت کی۔ سندھ کے مخصوص حالات میں حکمران طبقات کے مفاد پرست اقدامات اور معاشی اور انتظامی نوعیت کی خرابیاں وہاں آباد لسانی گروہوں کے باہمی تضادات کو اُبھارنے کا سبب بنی ہیں۔ دیہی سندھ کے عوام کی شکایات بہت پرانی اور بڑھ چکی تھیں۔ اُن کے اظہار کے لئے وہ کچھ عرصے سے مضطرب تھے۔ وڈیروں کو بھی اس بات کا پورا احساس تھا۔ چنانچہ اُنہوں نے اپنی سیاسی لیڈری برقرار رکھنے کے لئے ایم آر ڈی کے ایجی ٹیشن میں رہنما کردار ادا کرنے کا فیصلہ کیا۔ اِس طرح اُن پر سندھی عوام کا جو اعتماد کم ہوتا جا رہا تھا اُسے وہ دوبارہ حاصل کر سکتے تھے۔ جہاں تک سیاسی رہنماؤں کا تعلق ہے اُن کا ایک مزید مقصد یہ بھی ہو گا کہ فوجی حکمرانوں پر عوامی دباؤ ڈالا جائے تاکہ وہ انہیں الیکشن کے نااہل قرار دینے کا فیصلہ نہ کر سکیں۔ مگر متعدد دوسری وجوہ بھی ہیں۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں متعدد راہنما اور اُن کے عزیز و اقارب بعض ایسے سرکاری نوعیت کے سیاسی اور غیر سیاسی اداروں سے وابستہ ہو گئے تھے جنہیں سندھ کے دیہی عوام وقعت کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ چنانچہ متوقع انتخابات کے پیشِ نظر اُنہوں نے ایک ایسے عمل میں شمولیت کا فیصلہ کیا جس سے اُن کی رہبری پر اعتماد قائم ہو سکے۔ سول نافرمانی کی تحریک دیہی سندھ کے علاوہ عام طور پر حکومت کے مخالف سیاسی راہنماؤں اور کارکنوں تک محدود رہی۔ گو اِس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ جس نے تحریک میں حصہ نہیں لیا وہ حکومت کے ساتھ تھا یا ہے۔ دیہی سندھ کی حد تک عوام اِس تحریک میں شامل تھے اور یقیناً یہ عوام کی تحریک تھی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر دیہی سندھ کے عوام اتنے پرانے شاکی تھے تو وہ اِس سے پہلے مثلاً ۵ جولائی ۱۹۸۳ء کے احتجاج میں کیوں شریک نہ ہوئے، جب ایم آر ڈی کی طرف سے سول نافرمانی کی تحریک چلانے کی کوشش کی گئی تھی، حقیقت یہ ہے کہ اُس وقت بھی اندرونِ سندھ تحریک کے لئے تمام تر جواز موجود تھا۔ مگر تب تحریک اِس لئے نہ چل سکی کہ اُنہیں سندھی رہنماؤں کی عملی شرکت اور قیادت حاصل نہ ہو سکی تھی۔ یہ رہنمائی اُنہیں غلام مصطفیٰ جتوئی اور چند دوسرے

رہنماؤں کے بیرونِ ملک واپسی کے بعد جرأت مندانہ قیادت سے میسر آ گئی۔

بعض حلقوں میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ تحریک سندھ کے صرف ایسے چند اضلاع تک محدود تھی جہاں تشدد واقع ہوا۔ یہ درست نہیں، البتہ یہ درست ہے کہ تحریک کے دوران دیہی علاقوں میں تشدد واقع ہوا۔ بڑے شہروں میں جہاں سندھی بولنے والے افراد اقلیت میں ہیں۔ وہاں مظاہرے پُرامن ہوئے البتہ گرفتاریاں پیش کرنے والوں کی اکثریت دیہی علاقوں ہی سے بھیجی گئی۔ جہاں تک گاؤں کا تعلق ہے کم از کم ۱۴ اگست کے دن پورے سندھ میں شاید ہی کوئی قابلِ ذکر گاؤں ہوگا جہاں چھوٹا بڑا پُرامن جلوس نہ نکلا ہو۔ مشاہدہ بتاتا ہے کہ تحریک نے ایسے علاقوں میں زیادہ زور پکڑا، جہاں ایم آر ڈی یا پیپلز پارٹی کے رہنما زیادہ موثر تھے یا سندھی عوامی تحریک زیادہ منظم تھی۔

تشویش کی بات

ایم آر ڈی کی تحریک کو محض علاقائی تحریک کہہ کر رد کر دینا صحیح نہیں اور نہ ہی یہ رویہ ملک کی سلامتی کے لئے مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ اِس ضمن میں بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) عبدالرحمٰن صدیقی ایڈیٹر "پاکستان ڈیفنس جرنل" کے تاثرات قابلِ غور ہیں۔ سندھ میں بحالیٔ جمہوریت کی تحریک اور اسی دوران مخصوص علاقوں میں مسلح کاروائی کے واقعات پر بحث کرتے ہوئے بریگیڈیئر صدیقی نے لکھا ہے کہ۔

"ان کی بازگشت پاکستان کے دوسرے صوبوں میں بھی سُنی گئی۔ خاص طور پر بلوچستان اور پنجاب میں اِس لئے اِس معاملے کو صرف ایک صوبے کا معاملہ کہہ کر نہیں ٹالا جا سکتا۔ بلکہ یہ بات تو ہم سب کے لئے اور بھی باعثِ تشویش ہونی چاہیئے کہ محدود افراتفری کے اِس مختصر دور کا اطلاق صرف یا بیشتر ایک ہی صوبے میں ہوتا ہے۔

ملک کے چاروں صوبے چونکہ ایک ہی جسم کے چار اعضاء ہیں اِس لئے اگر ایک عضو بھی تکلیف میں ہو تو باقی تین کو بھی اتنی ہی تکلیف ہونی چاہیئے اگر ایسا نہ ہو تو البتہ تشویش کی بات ہے۔ کسی بھی تحریک میں خواہ وہ کتنی ہی مختصر کیوں نہ ہو کسی ایسے ایک صوبے کا تنہا رہ جانا کم از کم میرے نزدیک مُلکی یکجہتی اور سالمیت کے لئے نیک شگون نہیں ہو سکتا۔"

(جنگ ۱۲، نومبر ۱۹۸۳ء)

ہمارے خیال میں سیاسی شعور سے بہرہ ور مکاتبِ فکر اِس بات پر متفق ہیں کہ سندھ اور دوسرے سب علاقوں کے مسائل کی نوعیت کو سمجھنا چاہیے۔ یہ احساس خوش آئند ہے مگر تشویش اِس بات پر ہے کہ چند مؤثر گروہوں کی سوچ اب بھی غیر حقیقی ہے اور اِس بناء پر لسانی اور علاقائی مسائل سمجھنے میں تاخیر ہو رہی ہے۔ نئی صورت کو سمجھنے کے لئے ایسا اندازِ فکر ترک کرنے کی ضرورت ہے۔ حالات کو اُن کے حقیقی رنگ میں صحیح پس منظر میں اور معروضی طور پر سمجھنا لازمی ہو چکا ہے۔

شکایات کا پس منظر

اب ہم یہ جائزہ لیں گے کہ سندھ کی قدیم آبادی جس کی مادری زبان سندھی ہے، کی شکایات جو قیام پاکستان کے بعد پیدا ہوئیں کیا ہیں؟۔ اِس مسئلے پر بحث سے پہلے یہ وضاحت ضروری ہے کہ ہم نے سندھی بولنے والے افراد کے ہر طبقے سے ملاقاتیں کیں۔ خواہ وہ شہری ہوں یا دیہاتی، خواندہ ہوں یا ناخواندہ، خاص ہوں یا عام۔ ہم نے تہذیبی اور لسانی مسائل پر تقریباً سب ہی سندھیوں میں یکجہتی اور اتفاق پایا۔ البتہ معاشی اور سیاسی مسائل کے ادراک اور اُن کے حل کے سلسلے میں نقطۂ نظر میں فرق موجود تھا۔ عام طور پر سیاسی سوچ کا رجحان انتہا پسندی کی طرف مائل نظر آیا۔ ایسی شکایات جو بنیادی نوعیت کی ہیں اور دیر سے چلی آ رہی ہیں اُن کا ذکر ہم بعد میں کریں گے۔ سرِدست ہم اُن وجوہات کو بیان کریں گے جو گذشتہ چند سالوں میں پیدا ہوئیں۔ جن سے سندھیوں کا پیمانۂ صبر لبریز ہو کر چھلکا اور حالیہ تحریک کی صورت میں ظاہر ہوا۔ پاکستان کے ہر علاقے میں جرائم ہوتے ہیں، مگر اندرونِ سندھ امن و امان کی صورتِ حال ناگفتہ بہ تھی۔ ایسی صورت میں کرپشن قدرتی طور پر زیادہ بڑھی۔ یہ صورتِ حال تب پیدا ہوئی جب عوام کی منتخب حکومت موجود نہ تھی اور نظم و نسق کی ذمہ داری مجموعی اور اصولی طور پر مارشل لا حکومت پر عائد ہوتی تھی۔ عام سندھی اپنی شکایات کے ازالے کے لئے کسی عوامی نمائندے کے پاس نہیں جا سکتے تھے۔ دوسری طرف وہ فوجی انتظامیہ کے پاس جانے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتے تھے مزید یہ کہ فوج میں سندھ کی مؤثر نمائندگی موجود نہیں۔ اِس لئے سندھی عوام اپنے اور فوج کے درمیان گہرا تعلق محسوس نہیں کرتے، بلکہ عام تاثر کے مطابق اسے پنجاب اور سرحدی صوبے کی فوج تصور کرتے ہیں۔

تحریک سے چند ہفتے قبل مہران انجینئرنگ یونیورسٹی میں طلباء نے پُر احتجاج مطالبہ کیا کہ امتحانات کے لئے مروجہ گریڈ سسٹم کی بجائے مارکنگ سسٹم نافذ کیا جائے۔ یہ احتجاج تشدد پر منتج ہوا اور کم از کم ایک طالب علم فائرنگ سے جاں بحق ہو گیا۔ سندھ کے وزراء نے اِس واقعہ کا ہائی کورٹ کے جج سے تحقیق کروانے کا وعدہ کیا مگر وعدہ پورا نہ کیا گیا۔ اِس واقعہ کی مختلف روادیں سامنے آئیں تاہم جو کچھ مشہور ہوا وہ خاصا اشتعال انگیز تھا۔ اِس واقعہ کے بعد یونیورسٹی بند کر دی گئی اور مشتعل طالب علم دیہی علاقوں میں چلے گئے۔ اُن میں سے کچھ ایم آر ڈی کی مجوزہ تحریک کے کارکن بن گئے۔ اُنہوں نے دیہی علاقوں میں فعّال کردار ادا کیا۔ ادھر مرکزی حکومت نے سندھ گریجوایٹ ایسوسی ایشن پر پابندی عائد کر دی۔ ایسوسی ایشن کے دو ہزار اراکین میں سے اکثر حکومت کے اہلکار تھے۔ ایک خیال کے مطابق اِن اہلکاروں نے اِس پابندی کو اپنے اوپر عدمِ اعتماد کا اظہار سمجھا۔ اِس طرح سندھی بولنے والے بہت سے لوگوں کی دلآزاری ہوئی۔

تحریک کے محرکات کا جائزہ لیتے ہوئے سندھی بولنے والوں کی شکایتوں کے اِس طویل پس منظر کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے اور نہ ہی سندھیوں کی اس مزاجی کیفیت کو نظروں سے اوجھل ہونا چاہیئے کہ حساس ہونے کی وجہ سے جہاں عزتِ نفس پر آنچ آتی ہو وہاں اُنہیں مشتعل ہونے میں دیر نہیں لگتی۔ انہی دنوں سندھ میں ضیاء حمایت تحریک کو بھرپور طریقے

سے منظم کرنے کی کوشش کی گئی۔ عام تاثر کے مطابق ہر شہر، تعلقہ اور ضلع میں اِس کی برانچیں کھولنے کے لئے مالی وسائل میسر ہوئے۔ اِس تنظیم نے حکمران طبقہ کی تائید میں لٹریچر شائع کیا۔ تحریک سے کچھ عرصہ پہلے جنرل ضیاء الحق نے سندھ کے اندرونی علاقوں کا جزوی دورہ کرنے کے بعد ایک پریس کانفرنس میں اپنے دورہ کی کامیابی کے بارے میں برسرِ عام کہا کہ سندھ کے عوام اُنہیں مزید چھ سال تک برسرِ اقتدار رکھنا چاہتے ہیں۔ اِس پر اُن حلقوں نے جنہوں نے اُن کے اوّلین دورہ پر کسی مخالفانہ ردِعمل کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ اپنی سیاسی توہین محسوس کی اور اپنے جذبات کے اظہار کے لئے احتجاجی مظاہرے کرنے کا فیصلہ کیا۔

ایم آر ڈی کے حامی حلقے ۵ جولائی سے ۱۴ اگست ۱۹۸۳ء تک خاموش رہنے کا ایک سبب یہ بیان کرتے ہیں کہ اِس عرصے میں وہ ضیاء حمایت تحریک کی طاقت کا اندازہ لگاتے رہے۔

اپنے علاقے میں اجنبی

یہاں اِس نفسیاتی کیفیت کو سمجھنا بھی ضروری ہے کہ سندھی بولنے والے افراد متعدد وجوہ کی بناء پر جس کا ہم بعد میں جائزہ لیں گے، خود کو اپنے علاقے میں اجنبی سمجھنے لگے تھے۔ وہ سندھ میں نئے آباد ہونے والوں کے بڑھتے ہوئے اثر کو ناپسند کرتے ہیں۔ بایں ہمہ سندھی عوام مارشل لاء کے نفاذ سے قبل جناب ذوالفقار علی بھٹو کی سیاسی حکمرانی کو اپنی نفسیاتی تسلی کا موجب سمجھتے تھے۔ نفسیاتی تشفی کا یہ عنصر غائب ہو جانے سے اُنہیں صدمہ ہوا اور اِس طرح اُن کی شکایات میں تلخی کا اضافہ ہو گیا۔ مارشل لاء حکومت کے خلاف تحریک میں اِس تلخی کا بھرپور اظہار ہوا۔

بہت سے حلقوں سے سوال کیا جاتا ہے کہ ایجی ٹیشن ابتدائی دور میں ہی اتنے زیادہ تشدد کا رنگ کیوں اختیار کر گئی۔ ہر باخبر شخص جانتا ہے کہ پاکستان میں چلنے والی گذشتہ تحریکیں بھی کچھ عرصہ کے بعد پُرتشدد ہو گئی تھیں۔ تعجب تحریک کے پرتشدد ہونے پر نہیں، بلکہ اِس پر ہے کہ ابتدا ہی میں یہ رنگ کیوں آ گیا۔ یہ بات سمجھنے کے لئے ہر پُرتشدد واقعہ کی پوری تفصیلات کی سرکاری طور پر تحقیق کرنے کی ضرورت ہے۔ مزید یہ کہ کسی تحریک کے سلسلے میں شہر میں بسنے والے متوسط طبقے کے افراد اور دیہاتوں میں بسنے والے غریب عوام کا موازنہ کرنا موزوں نہیں۔ دیہاتیوں کا جلد اشتعال میں آجانا فطری عمل ہے۔ جبکہ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ دیہی علاقوں میں پولیس اور انتظامیہ کے پاس سیاسی مسائل سے نبرد آزما ہونے کے لئے وہ مہارت اور لچک موجود نہیں ہوتی جو بڑے شہروں میں اُنہیں میسر ہے۔ بڑے شہروں میں امن و امان کی خاطر محض حکم کی پابندی کا مطالبہ نہیں ہوتا بلکہ تدبر سے کام لے کر صورتحال کو بگڑنے سے بچانے کی زیادہ صلاحیت اور گنجائش ہوتی ہے۔ ہم انفرادی واقعات کی تحقیق کرنے کی پوزیشن میں نہیں۔ تاہم یہ بات قرینِ قیاس ہے کہ سابقہ تحریکوں اور موجودہ تحریک کے مابین جو بنیادی فرق اُوپر بیان کیا گیا ہے۔ اُس کے پیشِ نظر مظاہرین اور انتظامیہ کے حتی الامکان تشدد سے گریز کے باوجود تشدد کا جلد وقوع ناممکن نہیں تھا۔ رہا جیلیں توڑنے اور قیدیوں کو رہا کرانے کا معاملہ تو یہ واقعات ایسے ہیں کہ جو امن کے زمانے میں بھی سندھ میں متعدد بار ہوئے۔ جب قانون شکنی کی وسیع تر تحریک چل رہی ہو تو امن شکنی کے ایسے واقعات زیادہ سہل ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایجی ٹیشن کے دوران جرائم پیشہ عناصر نے اپنے مقاصد کی تکمیل کی کوشش کی ہو۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ سندھی رہنماؤں نے سب سے پہلے حتیٰ کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاسِ لاہور سے بھی پہلے قیامِ پاکستان کے مطالبے پر غور کیا تھا۔ چنانچہ جہاں تک حب الوطنی کا تعلق ہے، سندھی بولنے والوں کو کسی دوسرے

صوبے کی طرف سے کسی سند کی ضرورت نہیں۔ صوفیانہ اسلام سے تعلق سندھی مسلمانوں کی ممتاز خصوصیت ہے۔ مگر ان تمام خصوصیات کے باوصف یہ لوگ "سندھی" ضرور ہیں۔ سندھ کے مسائل کو سمجھنے اور شکایات کا جائزہ لینے کے لئے سندھی نقطۂ نظر کو سمجھنا بے حد ضروری ہے۔ اگر پاکستان کے حکمران طبقے سندھی نقطۂ نظر کو سمجھے بغیر اُن کے مسائل پر اپنا یکطرفہ فیصلہ ٹھونسیں گے تو الجھے ہوئے مسائل لاینحل ہو جائیں گے۔ ہر علاقے اور ہر لسانی گروہ کی کچھ خصوصیات اور امتیازات ہوتے ہیں۔ جن کا تعلق ہزار ہا سال کی تاریخ، جغرافیہ، آب و ہوا اور معاشی حالات سے ہوتا ہے۔ کسی کلچر کے تعین میں عقیدہ اور مذہب یقیناً اہم رول ادا کرتے ہیں مگر تاریخی پس منظر اور مادی حالات بھی کم اہم نہیں ہوتے۔ اب سب عناصر کی باہمی آمیزش سے ایک منفرد زاویۂ نگاہ یا سوچنے کا انداز متعین ہوتا ہے۔ ہر علاقے کے لوگوں کا سوچنے کا انداز مختلف پس منظر میں متعین ہونے کے سبب یکساں نہیں ہو سکتا۔

سندھی مزاج

یہاں ہم اس طویل بحث میں تو نہیں پڑیں گے کہ سندھ کا کلچر اور سوچنے کا انداز کس طرح بنا۔ مگر سندھ کے مسائل کو سمجھنے کے لئے مختصراً یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ سندھی مزاج اور سوچ کا انداز ہے کیا۔ ایک عام سندھی میں عدم تشدد، برداشت اور صبر کے اوصاف نمایاں ہیں۔ سندھی عام طور پر قانع اور راضی برضا لوگ ہیں۔ اُن میں ایک روحانی استغراق کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ جو انہیں پرانی تہذیب سے ملی ہے۔ یوں بھی ڈیلٹا کے رہنے والے خواہ وہ مصری ہوں یا ہند چینی کے باشندے، عموماً حلیم اور امن پسند ہوتے ہیں۔ ماضی میں اہلِ سندھ کا فطرت کے خلاف کوئی جارحانہ تصور نہیں رہا۔ کیونکہ انہیں اپنی معاشی زندگی کے لئے فطرت کے عطا شدہ دریائے سندھ کے باعث روزگار کے لئے شدید مشکلات کا مقابلہ نہیں کرنا پڑا۔ چنانچہ اُن میں فطرت سے اُنس کا رجحان پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سندھ میں روحانیت کی اثر پذیری کے لئے فضا سازگار رہی۔ سندھی صوفی شعراء شاہ عبداللطیف بھٹائی، سچل سرمست اور دوسرے صوفیاء کا محبت کا پیغام سندھی مزاج کا عکاس ہے۔ اِن تمام خصوصیات کے ساتھ سندھ کو اپنی سرزمین، تہذیب اور زبان سے گہری انسیت تھی۔ صوفی شعراء نے سندھ کے ریگستانوں، ریت کے تودوں، جھاڑیوں اور دریا کو فطرت کے انعامات کے طور پر سمجھا۔ تصوف اور علاقائی کلچر سے سندھی عوام کا بیک وقت شغف پاکستان بالخصوص پنجاب کے اُن حلقوں کی سمجھ سے بالاتر ہے جو مخصوص شریعت کے حوالے سے اسلام پر غور کرتے ہیں۔ اِس طبقے کی خصوصیت ہے کہ وہ حقیقت سے زیادہ تصورات کی دنیا میں رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مروجہ معروضی صورتحال پر پورا غور نہیں کرتا اور معروضی حالات میں جو بات بھی اُسے اپنے نظریئے سے متصادم نظر آتی ہے وہ اُسے غیر اسلامی اور غیر محبِ وطن قرار دے دیتا ہے۔ اِس کے برعکس سندھی اور دوسری قومیتیں جو اپنے علاقے اور کلچر پر فخر کرتی ہیں، وہ اُسے حب الوطنی یا اسلامی عقیدت سے متصادم نہیں سمجھتیں۔ یہ سوچ کے انداز کا فرق ہے، جس نے ملک میں ایک گھمبیر سیاسی اختلاف کی شکل اختیار کر لی ہے۔ درحقیقت یہ کوئی ٹھوس وجۂ اختلاف نہیں۔ تاہم بہت سی وجوہ جو ٹھوس نہ ہوں بلکہ محض جذباتی اور شعوری احساس کی نوع کی ہوں، وہ بھی نتائج کے اعتبار سے اتنی ہی اہم ہوتی ہیں جتنی ٹھوس حقیقتیں۔ اس لئے ہمیں کلچر اور علاقے کی محبت کے بارے میں پورا ادراک حاصل ہونا چاہیئے۔ اس کے لئے لازم ہے کہ ہم

ہر علاقے کے کلچر اور اس کے پس پردہ تاریخ، جغرافیہ اور مختلف نظریات کا گہرا مطالعہ کریں اور ہر علاقے کی سوچ کے انداز کو سمجھ کر اس کے مطالبات اور مسائل کو سلجھانے کی کوشش کریں۔

سندھ کی شکایات کے بارے میں جو کچھ لکھا جائے گا اُس کی بنیاد اِس حقیقت پر قائم ہے کہ سندھی عوام کو اپنی سرزمین سے اُنس ہے اور وہ اُس کے وجود کو محبت کا ایک مرکز سمجھتے ہیں۔ اِس بات کو جب ہم دوسری حقیقت کے ساتھ منسلک کریں کہ سندھ نے تحریک پاکستان میں اہم کردار ادا کیا تو واضح طور پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ جہاں سندھ کے لوگ برصغیر میں آزاد مملکت پاکستان قائم کرنا چاہتے تھے وہاں وہ پاکستان میں سندھ کا اپنا تہذیبی اور صوبائی وجود بھی قائم کرنا چاہتے تھے۔ سندھی عوام کی نظر میں صوبہ سندھ کا ایک علیحدہ مستقل وجود تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب ۱۸۴۳ء میں انگریزوں نے تالپور حکمرانوں سے پرانے معاہدے بالائے طاق رکھ کر طاقت کے بل بوتے پر سندھ کو بمبئی پریذیڈنسی میں شامل کر لیا تو سندھی عوام نے اس تبدیلی کو بخوشی قبول نہیں کیا۔ چنانچہ ایک طویل تگ و دو کے بعد ۱۹۳۶ء میں انگریز سندھ کو ایک جُدا صوبے کی حیثیت سے تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے۔

سندھ کے صوبائی وجود میں رَدّ و بَدل

اس پس منظر میں اب اِس پر غور کیجئے کہ قیام پاکستان کے بعد کراچی کے علاقے کو صوبائی حکومت سے علیحدہ کر کے مرکزی حکومت کے زیر انتظام کر دیا گیا۔ یہ سندھ کے لئے ایک جذباتی معاملہ بن گیا۔ اگرچہ سندھ اسمبلی نے اِس کی مخالفت کی مگر وفاقی حکومت کی اسلام آباد منتقلی تک کراچی وفاقی حکومت کے زیر انتظام رہا، اس پر مستزاد یہ کہ ۱۹۵۵ء میں مغربی پاکستان کی وحدت قائم ہوئی اور دوسرے صوبوں کی طرح سندھ کا علیحدہ وجود بھی ناپید ہو گیا۔ کراچی کی علیحدگی اور سندھ صوبے کا ناپید ہونا اِن دو معاملات کا تھوڑا سا تفصیلی ذکر مناسب ہو گا۔

مئی ۱۹۴۸ء میں پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے کراچی کے علاقے کو وفاقی انتظام کے تحت کر دیا۔ سندھ مسلم لیگ کونسل نے اپنے اجلاس منعقدہ ۱۱ جون ۱۹۴۸ء میں اِس فیصلے کو ناپسند کیا اور اِسے سندھ کی سرحدیں کم کرنے کی سازش سے تعبیر کیا۔ اِس فیصلے کے خلاف عام طور پر اور طلباء میں خاص طور پر زبردست ردِ عمل ظاہر ہوا۔ اِسی سلسلے میں ۱۱ جون ۱۹۴۸ء کو آٹھ سو سندھی مسلم طلباء کا ایک جلوس نکلا۔ سندھ اسمبلی میں اِس مسئلے پر گرما گرم تقاریر ہوئیں۔ سندھ مسلم لیگ کے سابق جنرل سیکرٹری آغا غلام نبی پٹھان نے جوشِ تقریر میں یہاں تک کہا کہ اگر کراچی کو سندھ سے علیحدہ کیا گیا تو ہم قرارداد پاکستان پھاڑ دیں گے۔ (ملاحظہ ہو روزنامہ "الوحید" ۱۱ فروری ۱۹۴۸ء) اس سندھی روزنامے نے کراچی کی علیحدگی کی مخالفت میں تین درجن قسط وار اداریاتی نوٹ تحریر کئے۔ خیال رہے کہ "الوحید" نے صحافت کے محاذ پر سندھ میں تحریکِ خلافت، بمبئی سے سندھ کی علیحدگی اور تحریک پاکستان میں بھرپور حصّہ لیا تھا اور خدمت کے عوض قائداعظم سے خراجِ تحسین بھی حاصل کیا۔

یہاں مسلم رہنما اور ماہنامہ "توحید" کے ایڈیٹر مولانا دین محمد وفائی کے ردِ عمل کا ذکر بھی بے جا نہ ہو گا۔ مولانا وفائی ڈیڑھ سو سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ آپ اٹھارہ سال تک روزنامہ توحید کے ایڈیٹر رہے ہیں۔ مولانا نے اپنے ماہنامہ "توحید" کے جنوری ۱۹۴۸ء کے شمارے میں قائداعظم کا نام لے کر ایک تلخ اداریہ تحریر کیا۔ (ترجمہ)

"وہ اس فیصلہ سے باز آنے والے نہیں۔ سوائے اِس کے کہ سندھ بالکل علیحدگی کا اعلان کر کے ایک مستقل اسٹیٹ کی صورت میں اپنے بچاؤ کی کوشش کرے۔ باقی موجودہ صورت میں جب تک مسلم لیگ کے کرتا دھرتا قائداعظم ہوں گے تب تک یہ ممکن ہی نہیں کہ اہلِ سندھ اپنی تحریک میں کامیاب ہو سکیں۔ کیونکہ جب ہم قائداعظم کو واجب الاطاعت امیر تسلیم کرتے ہیں تو ہمیں کیا حق حاصل ہے کہ اس کے کسی حکم یا ارشاد سے انحراف یا انکار کر سکیں۔ پنجاب شروع سے قائداعظم کے کسی بھی حکم کی تعمیل پر آمادہ نہیں ہوا۔ پنجاب کی طرح اگر سندھ بھی خودداری کا مظاہرہ کرتا تو کراچی کسی بھی حالت میں مرکز کے حوالے نہیں ہو سکتا تھا۔ اور نہ ہی یہ دِن دیکھنے پڑتے۔"

سندھی رائے عامہ کے خلاف ۱۹۵۵ء میں مغربی پاکستان کی وحدت قائم کی گئی اور مغربی پاکستان کے دوسرے صوبوں کی طرح صوبہ سندھ کا علیحدہ وجود ختم ہو گیا۔ سندھ کے سیاستدانوں، پڑھے لکھے نوجوانوں اور عام لوگوں نے ون یونٹ کو ایک بڑا عذاب تصور کیا۔ پڑھے لکھے لوگوں کی رائے یہ تھی کہ چونکہ اس وقت سندھ میں غلام محمد بیراج بن چکا ہے اور گدو بیراج کا کام شروع ہونے والا ہے۔ ان دونوں بیراجوں کی لاکھوں ایکڑ زرعی زمین کی تقسیم کا مسئلہ ہے اور چونکہ سندھ کی صوبائی حکومت کی جانب سے زرعی زمین کی تقسیم کے معاملہ میں مرکزی پالیسی کی مزاحمت ہو گی اس لئے سندھ کو مغربی پاکستان کے صوبے میں شامل کیا جا رہا ہے تاکہ زمینوں کی تقسیم لاہور میں کی جا سکے اور سندھ کی ملازمتوں کے بارے میں بھی پالیسیاں لاہور میں بنائی جائیں۔

ون یونٹ کی تشکیل کے وقت رائے عامہ کے اندر پوری طرح اِن خطرات کا احساس موجود تھا۔ سندھی لیڈروں کے بیانات اور تمام سندھی اخبارات کے اداریوں کالموں اور مضامین نے اِس خوف کا اظہار کیا۔ ہلالِ پاکستان، نوائے سندھ نیشن سندھ، کارواں وغیرہ تمام اخبارات نے ون یونٹ کے خلاف دسیوں، بیسیوں نہیں سینکڑوں اداریے لکھے۔ سندھ کے ممتاز اہلِ قلم اور صحافی مولانا خیر محمد نظامانی نے اِس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے روزنامہ مہران میں "ہوش و ہمت کی ضرورت" کے عنوان سے ایک تفصیلی اداریہ لکھا۔ ہم اِس کے ایک حصے کا ترجمہ درج کرتے ہیں جس سے عام سندھیوں اور سندھی رہنماؤں کی نفسیاتی کیفیت کی عکاسی ہوتی ہے۔

"ون یونٹ کے قیام کے بعد سندھ کے لوگوں کا بڑا طبقہ سخت فکرمند ہے اور اُسے سندھیوں کے مستقبل کی کوئی روشن تصویر نظر نہیں آتی۔ امید کی بجائے مایوسی اُن کے ذہنوں پر سوار ہے۔

"انسانوں کے جس طبقہ میں مایوسی، نا اُمیدی اور قنوطیت غالب ہو جائے وہ یقیناً زندگی اور دنیا کی دوڑ میں آگے بڑھنے کا حوصلہ کھو دیتا ہے۔ اور اُس کی تمام صلاحیتیں اور لیاقتیں مغلوبیت اور احساسِ کمتری کا شکار ہو جاتی ہیں اور اُس کے افراد "زندہ لاشوں" کی شکل نظر آتے ہیں۔

"سندھی لیڈروں کے ایک طبقہ نے سندھیوں کے اندر "ون یونٹ" کا خوف پیدا کر دیا ہے۔ "ون یونٹ" کے قیام سے ان لیڈروں کا ہم خیال طبقہ سمجھنے لگا ہے کہ جو قیامت برپا ہونی تھی وہ برپا ہو چکی۔ اب سندھ اور سندھیوں کا چکی کے دو پاٹوں میں ابدالآباد تک پستے رہنا یقینی امر ہے۔ اِس لئے "رضا بقضا" کے اصول پر عمل کرتے ہوئے لمبے پاؤں تان کر سو جانا اور موت کے فرشتے کے سامنے آنکھیں کھولنے کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے۔"

(۶ نومبر ۱۹۵۵ء)

ون یونٹ قائم کرنے کے لئے سندھ میں عبدالستار پیرزادہ کی وزارت ختم کی گئی۔ سندھ اسمبلی کے سپیکر غلام علی تالپور

کو گرفتار کیا گیا اور انہیں ریگستانی علاقے مٹھی کی جیل میں ذہنی اذیتیں برداشت کرنی پڑیں۔ ون یونٹ کے قیام کے خلاف طالبعلم، سیاسی رہنماؤں اور متعدد سرکاری ملازمین جنہوں نے نقل مکانی کی بجائے استعفے دے دیئے تھے۔ ون یونٹ کے قیام اور پنجاب کی بالادستی کے خلاف بھرپور پروپیگنڈہ کیا۔ چنانچہ ۱۹ ستمبر ۱۹۵۷ء کو غلام مصطفیٰ بھرگری نے مغربی پاکستان کی اسمبلی میں ون یونٹ توڑنے کی قرارداد پیش کی۔ یہ قرارداد تین سو اراکین کے ایوان میں ۲۹۶ کی اکثریت سے منظور ہوئی۔ مگر اس کے باوجود مغربی پاکستان کی وحدت ۱۹۷۰ء تک قائم رکھی گئی کیونکہ ایوب خان اس کے حامی تھے۔ فی الواقع ۱۹۵۸ء میں مارشل لاء کے نفاذ کا ایک سبب ون یونٹ کا تحفظ بیان کیا گیا۔ اس اقدام سے سندھ کی جو دل آزاری ہوئی اُس کو ایک واقعہ سے بیان کیا جاتا ہے۔ ون یونٹ کے قیام کے بعد زراعت کی ترقی کے لئے زرعی ترقیاتی کارپوریشن قائم کی گئی۔ جس کے فرائض میں نئی آباد ہونے والی زمینوں کی تقسیم کا کام شامل تھا۔ ایک اندازے کے مطابق اس کارپوریشن کا کام ۹۰ فیصد سندھ سے تعلق رکھتا تھا۔ مگر اس کا مرکز لاہور میں قائم کیا گیا اور اس میں کام کرنے والے اہلکاروں کی بہت بھاری اکثریت پنجاب سے تعلق رکھتی تھی۔ مارشل لاء کے نفاذ کے بعد فوج کے ریٹائرڈ ملازمین اس کے اعلیٰ عہدوں پر تعینات ہوئے۔

ون یونٹ کے قیام کے بعد سندھ کے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں احساسِ محرومی پیدا ہونے لگا۔ کیونکہ سندھ میں پولیس اور ضلعی انتظامیہ کے بڑے افسران عام طور پر غیر سندھی مقرر ہوتے رہے۔ جن کا مخصوص بیوروکریٹک اور حاکمانہ رویہ سندھی عوام میں ردِعمل کے طور پر علاقائی رجحانات کی تقویت کا باعث بنا۔

سندھی زبان

سندھ میں علاقائی رجحان کو مزید تقویت زبان کے مسئلے نے دی۔ ۱۹۶۲ء میں چھٹی جماعت کے بعد سندھی کی جگہ اُردو کو ذریعہ تعلیم بنا دیا گیا اور سندھی زبان کو صرف چھٹی جماعت تک لازمی رہنے دیا گیا۔ ایوب خان نے یہ فیصلہ تعلیمی اصلاحات کے کمیشن کی روشنی میں کیا۔ یہ فیصلہ ہوتے ہی سندھ کے طول و عرض میں احتجاج کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ۹ نومبر ۱۹۶۲ء کو پورے سندھ میں "یومِ سندھی زبان" منایا گیا۔ اس بارے میں سندھی رہنماؤں کے ساتھ چند مشرقی پاکستانی اور بلوچ رہنماؤں نے ایک مشترکہ بیان جاری کیا۔ جناب محمد موسیٰ بھٹو نے اپنی تصنیف "سندھ کے حالات کی سچی تصویر" میں اس کا متن درج کیا ہے۔

> "سندھی زبان گذشتہ ڈھائی سو سال سے پرائمری اور ثانوی سطح تک تعلیمی ذریعہ اور گذشتہ ۹۰ برس سے ثانوی تعلیم سے اعلیٰ کلاسوں تک تعلیمی اور امتحانی ذریعے کی حیثیت سے چلی آ رہی ہے۔ کمیشن کا یہ فیصلہ سندھی زبان کے ساتھ بہت بڑی ناانصافی ہے۔ لہٰذا ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ اس فیصلے کو فی الفور واپس لیا جائے۔"

اس بیان پر مندرجہ ذیل افراد کے دستخط تھے۔ مخدوم محمد زمان طالب المولیٰ، غلام مصطفیٰ جتوئی، پیر غلام رسول شاہ جیلانی، غلام محمد وسانی، شیخ عبدالمجید سندھی، محمود الحق عثمانی، محمد ہاشم گزدر، میر رسول بخش تالپور، محمد ایوب کھوڑو، قاضی فضل اللہ، مولا بخش سومرو، آغا غلام نبی پٹھان، نواب خیر بخش مری، شیر محمد مری، محمود علی (نیپ مشرقی پاکستان)

میجر افسر الدین، مسیح الرحمان۔

کمیشن کے اِس فیصلے نے سید سردار علی شاہ، اے کے بروہی، شیخ ایاز جیسے نظریاتی مخالفین کو ایک ہی پلیٹ فارم پر لا کھڑا کیا۔ سندھی نوجوانوں نے محسوس کیا کہ اُن کی زبان ختم کی جا رہی ہے۔

کمیشن نے جس مفروضے اور غیر ممالک کی مثالوں کو پیشِ نظر رکھا تھا۔ اُن کا اطلاق سندھی زبان پر نہیں ہو سکتا تھا۔ سندھی زبان ایک ترقی یافتہ زبان ہے۔ جس کا اپنا رسم الخط ہے۔ جس میں دوسری زبانوں کو جذب کرنے کی گنجائش موجود ہے۔ ایک تحقیق کے مطابق اس میں اڑھائی ہزار عربی اور دو ہزار فارسی کے الفاظ شامل ہیں۔ انگریزی زبان کی طرح اِس میں بھی ایک ایک چیز کے کئی نام ہیں۔ مثلاً اونٹ کے تیرہ اور مچھلی کے سوا سو نام ہیں۔ (بحوالہ سندھ کے حالات کی سچی تصویر صفحہ ۱۲۶۔ ۱۲۷)۔

اِس سے ظاہر ہوا کہ کمیشن کا فیصلہ معروضی صورتِ حال کے منافی تھا۔ جس کے خلاف ردِ عمل یقینی امر تھا۔ اِس معاملے کا سندھی بولنے والوں کے احساسات سے گہرا تعلق ہے۔ چنانچہ سندھی جوشیلے طبقے یعنی طالب علموں پر اِس کا سب سے گہرا اثر مرتب ہوا۔ جی ایم سید کے علیحدگی کے نظریات سندھی طلبا کے ایک حصّے پر مرتسم ہوئے بعد میں پیپلز پارٹی کے بڑھتے ہوئے اثر نے اِس صورتِ حال میں طبقاتی معاشی پروگرام کو شامل کر کے جئے سندھ کی تحریک کو کنٹرول کیا اور علیحدگی پسند طلبا کی بڑی تعداد کو سرکاری ملازمتیں دے کر اُن کو قومی دھارے میں مدغم کیا۔ تاہم سندھ کے تعلیمی اداروں میں مرکزی حکومت اور پنجاب کی بالادستی کے خلاف رجحانات موجود رہے۔ اور اُن کی شکایات گاہے بگاہے تعلیمی اداروں میں احتجاج کا موجب بنتی رہیں۔ تعلیمی اداروں کا طویل عرصے تک بند رہنا از خود حالات کی خرابی کا ایک سبب بن گیا۔ وہ نوجوان جنہیں حصولِ تعلیم کے بعد اپنی زندگی کو کسی مثبت انداز میں بسر کرنے کے قابل بننا چاہیئے تھا، ادھوری تعلیم کے ساتھ اپنے اپنے گاؤں میں بے مقصد زندگی گزارتے رہے۔ اور اکتاہٹ اور بیزاری کے اظہار کی وجہ سے سماجی اور سیاسی بے اطمینانی بڑھانے کا موجب بنے۔ ایسے طلبا کے ایک گروہ نے تحریک سول نافرمانی میں منظم کردار ادا کیا۔

قیامِ پاکستان سے سندھ کے عوام یہ توقع لگائے بیٹھے تھے کہ ہندو کے اثر سے آزاد ہونے کے بعد تعلیم، ملازمتوں اور تجارت کے میدان اُن کے لئے کھلے ہوں گے لیکن قیامِ پاکستان کے بعد اُنہیں پتہ چلا کہ ہندوؤں کی متروکہ جائیداد اور کاروبار پر مہاجرین کا قبضہ ہو گیا ہے۔ ملازمتوں کے معاملے میں بھی سندھی بولنے والے بدستور پیچھے رہ گئے۔ دیہات میں بسنے والوں نے یہ بھی دیکھا کہ سندھ میں آبیانہ کی شرح دوسرے صوبوں کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ مالیہ کی شرح بھی اونچی ہے۔ بہت سی متروکہ اراضی جو سندھی ہاریوں کے زیرِ کاشت تھی غیر سندھی افراد کو الاٹ کی گئی۔ یہاں سے ہاریوں کی بے دخلی واقع ہوئی۔ اِس پر حیدر بخش جتوئی کی ہاری کمیٹی نے متعدد بار احتجاج کیا۔ الاٹمنٹ وصول کرنے والوں کے بہت سے کلیم جعلی نکلے۔ الاٹمنٹ کے معاملات میں جعلسازی، رشوت رستانی اور اقربا پروری ہوئی۔ چھوٹے شہروں اور دیہی علاقے میں جائیدادیں الاٹ کرانے والوں نے بعد میں وہ جائیدادیں فروخت کر کے کراچی میں سکونت اختیار کر لی۔ یہ تفصیل بیان کرنے کی ضرورت اِس لئے پیش آئی کہ سندھی بولنے والے افراد نے اِس تمام عمل کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ کیونکہ اُن کے نظریہ کے مطابق سندھ میں موجود دولت پر اُن کا اوّلین حق ہے۔

سندھ میں آباد ہندو شہریوں کے بارے میں بعض حلقوں کا خیال ہے کہ اُنہوں نے تحریک میں محرک کے طور پر اہم کردار ادا کیا ہے۔ سندھ کے چند اضلاع میں ہندو مذہب کے پیروکار بڑی تعداد میں آباد ہیں۔ دیہی سندھ میں عام طور

براجناس کے آڑھتی اور بعض علاقوں میں دوا فروش اور متوسط پیمانے کے دکاندار ہندو مت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اِس اقلیت میں خوشحال متوسط طبقہ موجود ہے جو تعلیم کے میدان میں دوسروں سے پیش پیش ہے اور اسی سبب ڈاکٹری اور دوسرے آزاد پیشوں میں آگے بڑھ رہا ہے۔ ہماری معلومات کے مطابق ہندو اقلیت نے اِس ایجی ٹیشن میں کوئی نمایاں کردار ادا نہیں کیا یہ اِس بات سے ظاہر ہے کہ تھرپارکر میں جہاں اُن کی آبادی نسبتاً زیادہ ہے۔ ایجی ٹیشن کا اثر بہت کم تھا۔ اگرچہ ہندو آبادی کے اضلاع میں کچھ تشدد بھرے واقعات رونما ہوئے مگر ایسے واقعات تو وہاں بھی ہوئے ہیں۔ جہاں ہندو آبادی نہیں۔ میری رائے میں ہمیں اپنی کوتاہیاں جنہوں نے مسائل پیدا کئے، تسلیم کرنی چاہئیں اور اُن سے فرار اختیار کرنے کے لئے کمزور اقلیت پر الزام تراشی سے احتراز کرنا چاہیئے۔

پاکستان میں ہندو مسلم مسئلہ کھڑا کر کے ہم بھارت میں اپنے دس کروڑ ہم مذہبوں کی کوئی خدمت نہیں کریں گے۔ پھر کیا ہم سندھی قومیت کی ابتدائی شکایت کا الزام بھی ہندوؤں پر عائد کر سکتے ہیں۔ جو ۱۹۴۸ء میں کراچی کی سندھ سے علیحدگی سے پیدا ہوئی۔ اس کے بعد ۱۹۵۵ء میں سندھ کے مغربی پاکستان کی وحدت میں ادغام ہیراجوں کی اراضی کی الاٹمنٹ اور نیلام کے پرانے اعتراضات بہرحال تحریکِ پاکستان کے نامور سندھی رہنماؤں نے عائد کئے تھے۔ مسلم ریاست کی حیثیت سے ہمیں یہ اہتمام کرنا چاہیئے کہ یہاں ہندو اقلیت امن اور خوشحالی سے زندگی بسر کرے۔ ہمیں اِسے بھارتی حکومت کے لئے مثالی نمونہ بنانا چاہیئے۔

زرعی زمین کی ملکیت

مسلمانوں کے دورِ حکومت میں قانوناً سندھ میں ہندوؤں کو زمین کی خریداری کی اجازت نہ تھی چنانچہ ۱۸۴۳ء تک سندھ میں ہندوؤں کے پاس ایک ایکڑ زرعی زمین بھی نہ تھی لیکن انگریزوں نے آتے ہی یہ بندش ہٹا دی۔ ۱۹۲۵ء تک صورتحال یہ تھی کہ حکومت کے شائع شدہ اعداد و شمار کے مطابق سندھ میں چھوٹے مسلم کاشتکار ایک لاکھ ستائیس ہزار چونتیس تھے۔ جن کے پاس ۲۵ ایکڑ سے کم زمین تھی۔ (ملاحظہ ہو روزنامہ الوحید کراچی ۲ ستمبر ۱۹۳۷ء) لیکن ۱۹۴۶ء تک آتے آتے سندھ کی ۶۰ فیصد زرعی زمین مسلم کاشتکاروں یا زمینداروں سے نکل کر ہندو خریداروں یا قرض خواہوں کے ہاتھوں میں آ چکی تھی۔

پنجاب میں ایسا قانون بہت پہلے نافذ ہو چکا تھا۔ جس کے تحت کسی کاشتکار کی اراضی کوئی غیر کاشتکار نہیں خرید سکتا تھا۔ لیکن بمبئی کی ہندو اکثریت پریذیڈنسی میں سندھ کی شمولیت کے بعد اِس نوع کا بل بمبئی اسمبلی میں کوشش کے باوجود پیش نہ ہو سکا۔ بعد میں بمبئی سے علیحدگی کے بعد سندھ اسمبلی میں بھی ۱۹۴۶ء تک مسلمان ممبروں کی باہمی نااتفاقی اور ہندو اقلیت کے اتحاد کی وجہ سے اِس طرح کا بل پیش نہ کیا جا سکا۔ لیکن آخر کار جون ۱۹۴۷ء میں سندھ اسمبلی نے یہ بل منظور کر لیا۔ جس کے تحت ہندو ساہوکاروں کے پاس رہن شدہ مسلمانوں کی ساری اراضی انہیں واپس مل جانی تھی۔ اِس بل پر گورنر کے دستخط ہونے باقی تھے کہ پاکستان بن گیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد گورنر نے بوجوہ اِس بل پر دستخط نہ کئے۔ اور اِس زمین کا بہت سا حصہ ہندوؤں کی متروکہ املاک کے طور پر بعد میں مہاجرین کو الاٹ کر دیا گیا۔ اِس موضوع

پر تمام سندھی اخبارات نے ۱۹۵۸ء تک مسلسل ادارتی نوٹ لکھے۔ اِس کاروائی میں سندھ کے خود کار کاشتکار طبقے کو بڑا نقصان اُٹھانا پڑا۔

بیراجوں کی اراضی

سندھ کے تین بیراجوں میں فوجی ملازموں کے لئے کئی لاکھ ایکڑ اراضی مختص کی گئی۔ گدو بیراج میں سول ملازمین کے لئے بھی ہزار ہا ایکڑ اراضی رکھی گئی ہے۔ علاوہ ازیں مشینی کاشت اور نیلام کی سکیموں کے تحت یہاں لاکھوں کی تعداد میں غیر سندھی آباد کار آئے۔ دوسرے صوبوں نے بند باندھنے یا دوسرے مقاصد کے لئے جن کاشتکاروں سے اراضی قانوناً حاصل کی اُنہیں بھی سندھ میں کچھ اراضی الاٹ ہوئی۔ یہ تمام باتیں دیہی علاقے میں ناپسند کی گئیں اور بے چینی کا سبب بنیں۔

ون یونٹ کے دوران میں بیراجوں کی زمین جس طرح تقسیم ہوئی اُس سے لاکھوں سندھی ہاریوں کی دل شکنی اور حق تلفی ہوئی۔ ہاری پارٹی کی کوششوں سے ایک لاکھ سے زیادہ سندھی ہاریوں نے زمین کی الاٹمنٹ کے لئے درخواستیں دیں۔ ہاری پارٹی کے لیڈروں قاضی فیض محمدؒ (جو بعد میں عوامی لیگ پاکستان کے نائب صدر ہوئے) پیر نے بھوک ہڑتال تک کی۔ لیکن حکومت نے لاکھوں ایکڑ اراضی عام نیلام کے ذریعے فروخت کردی۔ اِس معاملے میں سندھی اخبارات نے سینکڑوں ادارتی نوٹ لکھے۔ اِن میں سے دو تین نوٹ درجِ ذیل ہیں۔

کوٹری بیراج کی زمین غیر سندھیوں کے ہاتھ فروخت کرنے کی افواہ کا حوالہ دیتے ہوئے مولانا خیر محمد نظامانی روزنامہ "مہران" کے شمارے مورخہ ۲۶ مئی ۱۹۵۷ء میں لکھتے ہیں۔

"اِس افواہ کی وجہ سے سندھ کے لوگوں میں جو اضطراب پیدا ہو گیا ہے۔ وہ افواہ کی صحت کے نتیجہ میں کئی گنا بڑھ جائے گا اِس کے بعد مرکزی یا صوبائی حکومت سندھی عوام سے کسی تعاون اور دوستی کی امید نہیں رکھ سکتی۔ اِس لئے کہ یہ پیٹ کا سوال ہے۔ جس پر ہم ہر ایک سے لڑنے کے لئے تیار ہیں اور ہم کسی کو یہ اجازت دینے کے لئے تیار نہیں کہ وہ ہمارا ذریعہ معاش ہم سے چھین کر کسی اور کے حوالے کرے۔

کوٹری بیراج کی زمین پر سب سے پہلا حق سندھ کے بے زمین ہاریوں کا ہے۔ جس میں سے بیشتر کے پاس کاشت کے لئے بھی زمین نہیں ہے۔ کیونکہ بھارت منتقل ہونے والے ہندوؤں کی جن زمینوں پر وہ کاشت کرتے تھے۔ نصف سے بھی زیادہ مہاجروں کو الاٹ کی گئی ہیں۔ ہم سندھ کی تمام سیاسی اور سماجی تنظیموں اور سندھی اخبارات کو درخواست کریں گے کہ زرعی زمین مقامی لوگوں کو دینے کے سلسلے میں اپنی آواز بلند کریں۔ سندھ کی رائے عامہ کو بیدار اور منظم کریں جب تک اہلِ سندھ اپنے حلقوں کے لئے مشترکہ آواز بلند نہ کریں گے اور منظم حرکت نہیں کریں گے، تب تک اُنہیں کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اِس لئے کہ اِس جہانِ عمل میں بے عملوں، کاہلوں اور گراں خواب لوگوں کا کوئی حصہ نہیں ہے"۔ (ترجمہ)

اپریل ۱۹۶۲ء میں مسٹر علی گوہر کھوڑو نے مغربی پاکستان اسمبلی میں گدو بیراج کی زمینوں کی نیلام کی پالیسی کے خلاف تحریکِ التوا پیش کی۔ تحریکِ التوا تو مسترد ہو گئی۔ لیکن بعض سندھی ممبران نے اُس بائیکاٹ میں حصّہ نہیں لیا۔ جو بطور احتجاج کیا گیا۔ اِس پر سندھ میں سخت ردِ عمل ہوا۔ مولانا خیر محمد نظامانی نے اِس موضوع پر "نوائے سندھ" حیدر آباد کے

شمارے مورخہ ۱۴ اپریل ۱۹۶۴ء میں ادارتی نوٹ لکھا۔

"۱۴ اپریل کا دن مغربی پاکستان اسمبلی کی تاریخ میں ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے جب مسٹر علی گوہر کھوڑو کی گدو بیراج کی زمینوں کی نیلام کے خلاف التواء کی تحریک کو اسپیکر نے مسترد کر دیا۔ ہمیں اسپیکر مسٹر جمیل الحق کے خلاف کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ اقلیتی گروہ کی ہر تجویز کو مسترد کرتا رہا ہے۔ نہ ہی ہمیں پنجابی وزیر ملک قادر بخش کی سندھی ممبروں کو ٹھینگے دکھانے اور انتباہ کرنے پر افسوس ہے۔ اس لئے کہ وہ جس گروہ کی نمائندگی کر رہا ہے اس گروہ کا مقصد ہی سندھ والوں کو سندھ کی زمین سے محروم کرنا اور سندھ میں اپنی زمینداریاں قائم کرنا ہے۔

"اسی طرح ہمیں سرکاری بنچوں کے اُن ممبروں سے بھی شکایت نہیں ہے جو گدو بیراج کی زمینوں کے سوال پر سندھیوں کے ساتھ انصاف کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں اور جو اس بے انصافی اور بے رحمی کے جذبہ میں اس قدر آگے بڑھ گئے ہیں کہ اُنہوں نے ایوان کو مچھلی مارکیٹ بنا دیا ہے۔ ہمیں دکھ، افسوس اور ہماری شکایت اُن ممبروں سے ہے جو سندھ کے باشندے ہیں اور باپ دادا کے دور سے سندھ میں رہائش پذیر ہیں اور جو سندھ کے لوگوں کے ووٹوں سے منتخب ہو کر اسمبلی میں پہنچے ہیں۔ یہ اُن کی سندھ اور سندھ کے عوام سے غداری ہے۔ اور شرمناک غداری ہے۔ کہ اُنہوں نے تحریک التواء کے مسترد ہونے پر واک آؤٹ کرنے والے سندھی ممبروں کے ساتھ واک آؤٹ نہ کیا اور یوں سرکاری کرسیوں پر بیٹھے رہے گویا کرسیوں نے کسی مقناطیسی اثر سے اُنہیں باندھ رکھا ہے۔

"ہم حکومت کے ہاتھوں خرید ہو جانے کے بعد اُنہیں طعنہ نہ دیتے اگر یہ نہ دیکھتے کہ اُنہوں نے بھی گدو بیراج کی زمینوں کے نیلام کے خلاف آواز بلند کی ہے اگر اُن کی یہ آواز منافقت کی آواز نہ ہوتی تو پھر نیلام کے خلاف تحریک التواء کے مسترد ہو جانے کے وقت اُن کے لئے دوسرے ممبروں کے ساتھ واک آؤٹ کرنے میں کیا عذر تھا۔ کیا اُنہیں ڈر تھا کہ ایک بار سرکاری کرسیاں چھوڑ کر واک آؤٹ کریں گے تو دوبارہ اُنہیں اُن کرسیوں پر بیٹھنے نہیں دیا جائے گا۔"

"ہم اِن کرسی پرستوں کو بتانا چاہتے ہیں کہ تمہیں یہ کرسیاں مبارک ہوں۔ لیکن مہربانی کر کے لاہور میں ہی اِن کرسیوں پر بیٹھے رہنا اور اجلاس مکمل ہونے کے بعد بھی سندھ کی سرزمین میں پاؤں نہ رکھنا۔ اِس لئے کہ تم نے سندھ سے غداری کی ہے، سندھ کے لوگ تمہاری شکل دیکھنے کے روادار نہیں، اور تو اور تمہاری اولاد، عزیز و اقارب تک تمہاری شکل دیکھنے کے لئے تیار نہیں تم نے اپنی بزدلی، جاہ پرستی اور سندھ سے بے وفائی میں ایسا نام پیدا کیا ہے کہ یہاں جب تمہارا تذکرہ ہوتا ہے تو تم سے نسبت رکھنے والوں کی گردنیں شرم سے جھک جاتی ہیں۔" (ترجمہ)

واضح ہو کہ مولانا خیر محمد نظامانی اپنے دینی کردار، انگریز سامراج کے خلاف ایجی ٹیشن اور لواری حج کو بند کرانے کی تاریخی جدوجہد کی وجہ سے سندھ میں اسلام کے علمبردار سمجھے جاتے ہیں۔ جی ایم سید کے پاکستان کے مخالفانہ رویے کے خلاف اُنہوں نے بیسیوں مضامین رقم کئے ہیں۔ اُن کی اسلام اور پاکستان دوستی پر کوئی شک و شبہ نہیں کیا جا سکتا اندازہ لگائیے کہ زرعی زمینوں کے بارے میں اُن جیسے فرد کے جذبات کا عالم کیا تھا۔

کوٹڑی بیراج کی پانچ لاکھ ایکڑ اراضی نیلام کرنے کی تجویز اور فوجیوں کو الاٹمنٹ کے مسئلے پر ممتاز صحافی سید سردار علی شاہ نے بھی اِس قسم کے خیالات کا اظہار کیا۔

"کوٹڑی بیراج کی زمین کی تقسیم کے سلسلے میں مزید جو اطلاعات آئی ہیں اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ مغربی پاکستان کے ریونیو بورڈ نے بیراج کی پانچ لاکھ ایکڑ زمین نیلام کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ہمیں مغربی پاکستان حکومت سے اِس قسم کی باز پرس کرنے کا پورا حق

حاصل ہوگا کہ اُس نے کیوں کر اپنی پالیسی عوامی تقاضوں اور انصاف کے برعکس مرتب کی ہے ۔ کوٹڑی بیراج کی تعمیر کا پہلا مقصد یہ تھا کہ سندھ کی اراضی سندھ کے ہاریوں اور بے زمین کاشتکاروں کو مہیا کی جائے ۔ اِس لئے سندھ کے لوگوں پر بھاری محصول اور ٹیکس عائد کر کے اور دوسرے ترقیاتی کام روک کر بیراج کے لئے لاکھوں روپے جمع کئے گئے ۔ لوگوں نے اِس بوجھ کو اِس لئے برداشت کیا کہ انہیں یقین تھا کہ جب بیراج تکمیل پا جائے گا تو اِس سے سندھ کے لوگوں کو فائدہ ہوگا۔ لیکن بیراج تعمیر ہو جانے کے بعد حکومتِ مغربی پاکستان کی طرف سے زمینوں کی تقسیم کے متعلق جو پالیسی مرتب کی جا رہی ہے وہ اِس قدر مایوس کن ہے کہ سندھ کے لوگوں کی ساری توقعات خاک میں مل گئی ہیں۔" (ترجمہ اداریہ روزنامہ "مہران" حیدرآباد ۔ ۳ مارچ ۱۹۵۸ء)

ایک تجویز کے مطابق گدو بیراج کی صرف ۲۰ فیصد اراضی مقامی ہاریوں کے لئے مختص کی گئی۔ اِس مسئلے پر "مہران" نے ۴ جنوری ۱۹۶۲ء کو یہ اداریتی تبصرہ کیا ۔

"ہمارے نزدیک گدو بیراج کے لاکھوں ہاریوں اور اِس علاقہ میں صدیوں سے آباد ہونے والوں کے لئے اتنی فیصد کافی نہیں ہے ۔ جبکہ ہر ہاری اور آباد کار کو کم از کم گذارے کے لائق زمین دینی چاہیئے ۔ موجودہ صورت میں ہمارے حساب سے اِس علاقہ کے بمشکل ۲۰ فیصد ہاریوں اور آبادکاروں کو زمین حاصل ہو سکے گی ۔ باقی ۸۰ فیصد ہاری زمین سے محروم رہ جائیں گے۔ اِس لئے ہم نے اپنے پہلے اداریتی نوٹ میں مشورہ دیا تھا کہ جملہ زمین کا ۷۵ فیصد ہاریوں اور آبادکاروں کو دیا جائے اور نیلام کے طریق کار کو ختم کیا جائے اِس وقت بھی ہمارا مشورہ یہی ہے ۔ جس پر اگر عمل کیا گیا تو گدو بیراج اراضی کے ہاریوں کی حق رسی ہو سکے گی۔ ورنہ زمین کے نیلام کی جو ابتدائی قیمتیں مقرر کی گئی ہیں وہ اتنی زیادہ ہیں کہ اِس علاقہ کے ہاریوں اور زمین پر صدیوں سے بسنے والوں کے لئے یہ ممکن ہی نہ رہے گا کہ وہ زمین خرید سکیں۔"

"ہمیں افسوس ہے کہ مغربی پاکستان کی حکومت سندھ کے باشندوں کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتی۔ اِس کا ایک سبب یہ ہے کہ سندھ کے لوگ آواز بلند کرنے کے عادی نہیں ہیں ۔ وہ یہ احساس رکھتے ہیں کہ حکومت خود بخود اُن کے مسائل کی طرف توجہ دے گی۔ اور وہ اُن کے مسائل کو از خود سمجھے گی۔ حالانکہ یہ ضروری نہیں ہے کہ حکومت ہر معاملہ کو صحیح طور پر سمجھ سکے ۔ گدو بیراج کی زمین کی تجویز کردہ رقم ہی کو دیکھئے ۔ صوبائی حکومت لوگوں کی اقتصادی بدحالی سے بے خبر ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ اِس علاقے کے لوگوں میں بھی زمین خرید کرنے کی اتنی ہی قوت ہے جتنی پنجاب، کراچی یا دوسرے علاقہ کے لوگوں کی ہے۔ اِس طرح شاید وہ اِس غلط فہمی میں بھی مبتلا ہے کہ چونکہ گدو بیراج کے علاقے کے لوگ زندہ ہیں۔ اِس لئے اُنہیں ذریعۂ معاش کی اتنی زیادہ تکلیف نہیں ہوگی ۔ حالانکہ جاننے والے جانتے ہیں کہ وہاں حالات اتنے خراب ہیں کہ لوگ پیٹ سے بندھ کر زندگی بسر کرتے ہیں۔" (ترجمہ)

اہلِ سندھ نے بیراجوں کی تعمیر سے جائز طور پر یہ توقع وابستہ کی تھی کہ اب ہاریوں کی قسمت بدل جائے گی ۔ سندھی اخبارات کا یہ مطالبہ بالکل صحیح تھا کہ بیراجی زمین کی تقسیم میں مقامی ہاریوں کو اولیت دی جائے۔ غریب ہاریوں کی قوتِ خرید کی کمزوری کو اِس معاملے میں آڑے نہیں آنا چاہیئے ۔ اِس مشکل کے حل کے لئے حکومت کو امدادی اقدام کرنے چاہئیں تھے مگر اِس کے برعکس بہت سی زمین ایسے اصحاب کو دی گئی جو کسی اعتبار سے ہاریوں سے زیادہ مستحق نہ تھے ۔ اِسی طرح جہاں تک بیراجی زمینیں سرکاری اور فوجی افسروں کو الاٹ کرنے کا تعلق ہے ۔ اِس کا کوئی قومی یا معاشی جواز نہ اُس وقت تھا اور نہ ہی اب ہے ۔ اِس مسئلے نے دیہی سندھ میں بدستور سیاسی تلخی پیدا کر رکھی ہے ۔ اور سندھ کے طول و عرض میں بڑے کرب سے اِس کا اظہار ہوتا ہے،

سندھی بولنے والی دیہی آبادی کی پسماندگی کا ذکر کرتے ہوئے دوسری وجوہ کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ پسماندگی کی تاریخی اور بڑی وجہ سندھ کے متعدد علاقوں میں جاگیرداری نظام ہے۔ جسے سندھ کی ہاری تحریکوں کے سوا تقریباً ہر موثر سیاسی قوت نے استحکام بخشا ہے۔ جاگیرداری نظام جہاں بھی رائج ہو وہاں معاشی اور معاشرتی پسماندگی عوام کا مقدر بن جاتی ہے۔ اِس اصول کا اطلاق ہر علاقے پر ہوتا ہے۔ چنانچہ پنجاب اور سرحد کے اُن علاقوں میں بھی جہاں یہ نظام قائم ہے عوام کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ اِسی طرح بارانی علاقوں میں ہر کہیں غربت پائی جاتی ہے۔ البتہ اُن علاقوں میں جہاں چھوٹے مالک کاشتکاروں کی تعداد زیادہ ہے یا جہاں دیہی لوگ غیر ملکوں میں جاکر ملازمتیں کر رہے ہیں۔ وہاں معاشی حالت سدھرنی شروع ہوئی ہے۔ یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہمارے ترقیاتی منصوبوں میں، سوائے دفاعی اعتبار سے اہم علاقوں کے دیہی سماجی ترقی کے لئے کوئی معقول رقم مختص نہیں کی گئی حالانکہ شہروں اور دیہی علاقوں میں معیارِ زندگی کے فرق کو کم سے کم کرنے کی بھرپور کوشش ہونی چاہیئے۔

شہری اور دیہی زندگی کا تفاوت۔

شہری اور دیہی علاقوں میں معاشی تفاوت کا بڑھتا ہوا رجحان بھی دیہی سندھ میں بے چینی کا سبب بنا۔ ہر پسماندہ ملک کی طرح پاکستان میں بھی جدید صنعت اور پسماندہ دیہی معیشت میں تفاوت پایا جاتا ہے۔ لیکن یہ تفاوت اور تضاد صوبہ سندھ کے معاشی ڈھانچے میں خصوصیت سے اُبھرا ہے۔ کراچی اور اُس کے آس پاس اور کسی حد تک حیدرآباد میں جدید صنعتیں قائم ہوئیں اور کراچی شہر کا ایک حصہ جدید طرزِ زندگی اختیار کر گیا۔ اِس کے مقابلے میں سندھ کا دیہی علاقہ جدیدیت کے بیشتر اثرات سے محروم رہا۔ اگرچہ پاکستان کے جدید صنعتی سیکٹر میں ہر کہیں یہی خصوصیت تھی لیکن کراچی میں نصب ہونے والے اکثر کارخانوں کی خصوصیت نمایاں تر تھی کہ اُن کے لئے خام مال کی ضروریات اندرونِ ملک کی بجائے درآمدات سے پوری ہوتی رہیں۔ کراچی کی صنعتی معیشت غیر ملکی قرضوں اور عام طور پر غیر ملکی مشینری اور خام مال کی بنیاد پر پروان چڑھتی رہی پنجاب کی طرح سندھ کے صنعت کاروں نے بھی اپنے منافع کو دیہی معیشت کی ترقی کے لئے صرف نہ کیا۔ مگر یہ کہنا بھی یکسر صحیح نہیں کہ سندھ کی صنعتی ترقی کے دیہی معیشت پر کوئی مفید اثرات مرتب نہیں ہوئے۔ ٹیکسٹائل اور شکر سازی کی صنعتوں کے مفید زرعی اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ کیمیکل کھاد کے کارخانوں سے بھی فائدہ حاصل ہوگا۔ اِس وقت بھی فی کس زرعی پیداوار اور فی کس زرعی آمدن کے اعتبار سے صوبہ سندھ پاکستان کے دوسرے صوبوں سے کہیں بہتر ہے۔

البتہ سندھ کے مخصوص حالات میں بڑے شہروں کی ترقی کے باوجود مقامی دیہی آبادی کے شہروں کی طرف نقل مکانی نہ ہوئی۔ شہروں میں تیز رفتاری سے جو صنعتیں نصب ہوئیں، اُن کے لئے لیبر بھارت سے ہجرت کر کے آنے والوں اور بعد میں پنجاب اور صوبہ سرحد سے میسر ہوتی گئی۔ پاکستان میں صنعتکاری کی شروعات ٹیکسٹائل کی صنعت سے ہوئیں۔ اِس صنعت کے لئے ابتداء میں تربیت یافتہ اور نیم تربیت یافتہ لیبر مہاجرین نے مہیا کر دی۔ دوسری صنعتوں کے لئے بھی نئے نئے ہنر سیکھنے کی زیادہ صلاحیت اِسی طبقے یا پنجابی محنت کشوں میں تھی۔ یوپی سے نقل مکانی کرنے والے افراد کا ایک گروہ گھریلو صنعتوں کے کام کا تجربہ رکھتا تھا۔ چنانچہ دستکاری کے شعبے میں بھی یوپی اور دہلی کے مسلم مہاجرین نے

کمی پوری کی ۔ مگر یہ طبقہ بھی شہروں میں آباد ہوا ۔ یوں سندھ کے دیہی علاقے چھوٹے اور گھریلو صنعتوں کے معاملے میں بدستور پسماندہ رہے ۔ پنجاب کے چند اضلاع کے دیہی علاقوں میں مشین سازی کی صنعت نے ترقی کی مثلاً ٹیوب ویل اور زرعی آلات بنانے کے چھوٹے اور متوسط پیمانے کے کارخانے نصب ہوئے ۔ مگر سندھ میں ایسے کارخانے بھی شہروں ہی میں لگے ۔ باوجود اِس کے کہ پاکستان میں نصب ہونے والی بڑی صنعتوں کی زیادہ تعداد صوبہ سندھ میں قائم کی گئی ۔ جہاں تک دیہی معیشت کا تعلق ہے ۔ سندھ میں زراعت پر دیہی لیبر فورس کا انحصار دوسرے صوبوں کے مقابلے میں نسبتاً کہیں زیادہ ہے ۔ سندھ کے ایڈیشنل چیف سیکرٹری کے بیان کردہ اعداد و شمار کے مطابق سندھ میں دیہی لیبر فورس کا ۸۲ فیصد حصّہ زراعت میں مشغول ہے ۔ جبکہ صوبہ سرحد اور پنجاب میں یہ شرح بالترتیب ۶۹ اور ۷۳ فیصد ہے ۔ جہاں تک صنعتکاری کا تعلق ہے سندھ میں دیہی لیبر کا صرف ۲٫۵ فیصد حصّہ اس شعبے سے تعلق رکھتا ہے جبکہ پنجاب اور سرحد میں ان کی تعداد علی الترتیب ۱۲ اور ۶ فیصد ہے ۔ (بحوالہ اکانومی آف ماڈرن سندھ ، انسٹی ٹیوٹ آف سندھالوجی) یہی وجہ ہے کہ سندھ کے دیہی علاقے میں نیم بیروزگار افراد کی تعداد نسبتاً زیادہ پائی جاتی ہے ۔ اِس صورتِ حال نے سندھی بولنے والوں میں مہاجروں اور پنجابیوں کے خلاف جذبات اُبھارے ۔ جو شہری علاقوں کی معیشت کو کنٹرول کرتے ہیں ۔ جس میں روزگار کے مواقع پیدا ہوئے مگر سندھی بولنے والوں کو کوئی قابلِ ذکر حصہ نہ ملا

مسلم قوم سے سندھی قومیت تک کا سفر

سوچ جہاں مذہبی نظریات سے اثر پذیر ہوتی ہے وہاں وہ مادی حالات کے بھی تابع ہوتی ہے۔ آج کل سندھی بولنے والوں میں مہاجروں اور آبادکاروں کے بارے میں جو نظریات پائے جاتے ہیں، وہ ہمیشہ اس طرح نہ تھے۔ یہاں ہم چند مثالوں سے یہ واضح کرنے کی کوشش کریں گے کہ قیام پاکستان سے پہلے سندھ کے مسلمان متعدد معاملات میں کم و بیش اسی طرح سوچتے تھے۔ جیسے پنجاب کے اکثر مسلمان اب تک سوچتے ہیں۔ غیر منقسم ہندوستان میں سندھ کے مسلمان باشندوں نے مقامی ہندوؤں کے مقابلے میں سندھ کی ملازمتوں کے لئے اپنا علیحدہ کوٹہ قائم کرایا اور چونکہ اُس وقت سندھ کے مقامی مسلمان مطلوبہ تعداد میں موجود نہ تھے، اس لئے سندھی مسلمانوں نے اپنے کوٹے سے پنجاب کے مسلمانوں کو ملازمتیں دلوائیں۔ سندھ میں ملازم ایک پنجابی پولیس افسر مولوی ضیاء الدین احمد نے ۱۹۳۵ء میں مسلمانانِ پنجاب کی سالانہ کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے نصیحت کی کہ پنجابیوں کو سندھیوں کے ساتھ اچھا رویہ رکھنا چاہیئے۔ نیز سندھ کو اپنا وطن تصور کرنا چاہیئے۔ اُس وقت کے اہم سندھی اخبار "الوحید" نے اِس خطاب پر اِس لئے تنقید کی کہ اِس میں پنجاب اور سندھ کے مسلمان کو جُدا جُدا تصور کیا گیا ہے۔ اخبار نے ۱۱ اکتوبر ۱۹۳۵ء کے شمارے میں "ناگوار بحث" کے عنوان سے اداریہ لکھا۔

"اسلام میں وطن، رنگ اور نسل کی کوئی تفریق نہیں۔ مسلمان جہاں بھی جائے وہ اُس کا وطن ہے۔ اور جہاں بھی اُس کا قیام ہو اور رزقِ حلال کے لئے عرق جبین کرے وہ اُس کا دیس ہے۔ بلکہ مسلمانوں کا یہ فرض ہونا چاہیئے کہ وہ جس علاقہ میں محنت کریں اور اُس کا پانی پیئیں، اُس علاقہ کے لوگوں اور اپنے درمیان کوئی تفریق نہ کریں۔ لیکن افسوس ہے کہ بعض صاحبان اِس اصول کی خلاف ورزی کرتے ہوئے سندھ میں سندھی اور غیر سندھی کے سوالات اٹھاتے ہیں۔ جس طرح حال ہی میں مولوی ضیاء الدین احمد نے کچھ لوگوں کی شکایت پر اِس مسئلہ کو وہ رنگ دیا ہے جو مسلمان کو زیب نہیں دیتا۔ محترم ضیاء الدین کو اِس بات کا ذاتی تجربہ ہوگا کہ وہ خود، مسٹر نورنبی اور محمود شاہ وغیرہ سندھ میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ کیا اُنہوں نے اپنے کانوں سے اِس طرح کی سندھی اور غیر سندھی کی ناگوار بحث کبھی سنی؟ اور سندھی مسلمان کبھی اِس پر ناراض ہوئے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ سندھی مسلمانوں نے اپنے اِن بھائیوں کے وہاں موجود ہونے پر فخر محسوس کیا۔ سندھی مسلمانوں کی حالت تو یہ ہے کہ اُنہوں نے اپنے علاقہ میں پولیس کا بڑا حصہ اپنے بھائیوں کے حوالے کر دیا ہے۔ پولیس ہیڈ کوارٹر میں پانچ ہزار سرکاری ملازم ہیں۔ اِن میں گنتی کے چند افراد کے علاوہ باقی سب ہمارے پنجابی بھائی ہیں۔ لیکن سندھی مسلمانوں نے اِس پر کبھی اعتراض نہیں کیا۔ اِس حقیقت کے

باوجود ذمہ دار افراد کی طرف سے مسلمانوں کے درمیان تفریق پیدا کرنے کی اور سندھی اور غیر سندھی کا سوال اٹھانے والی باتیں کرنا زیب نہیں دیتا۔ ہمیں امید ہے کہ آئندہ اِس طرح کا مسئلہ پیدا نہیں ہوگا۔" (ترجمہ)

سندھ کے مسلم اخبارات، سندھ مسلم لیگ اور صوبائی حکومت نے ۱۹۴۶ء کے دوران صوبہ بہار میں فسادات کے معاملے میں زور دار احتجاج کیا اور مصیبت زدہ بہاری مسلمانوں کی امداد اور آباد کاری کے لئے بھرپور اقدامات کئے۔ روزنامہ "الوحید" مورخہ ۸ جنوری ۱۹۴۷ء میں ایک خبر شائع ہوئی۔ اس کے متن سے سندھ کی اُس وقت کی سوچ مترشح ہوتی ہے۔ خبر یہ ہے۔

"آج مسٹر ایوب کھوڑو کے بنگلہ پر اُن کی صدارت میں بہار ریلیف کمیٹی کی پہلی میٹنگ ہوئی جس میں کمیٹی کے معزز ممبروں کے علاوہ الوحید کے ایڈیٹر عبدالغفور سیتائی اور مولانا عبدالقدوس بہاری شریک ہوئے۔ میٹنگ میں اِس بات پر غور ہوا کہ صوبہ بہار سے جو مظلوم اور مصیبت زدہ مسلمان سندھ میں ہجرت کرکے آرہے ہیں، اُنہیں آباد کرنے کے لئے سندھ مسلم لیگ حکومت اور پارٹی کیا کچھ کرسکتی ہے۔

"مسلم لیگ حکومت کی طرف سے بہار کے مسلمانوں کو سندھ میں آباد کرنے اور اُنہیں روزگار دلانے کے لئے ہر ممکن امداد کا فیصلہ کیا گیا۔ بہار کے مہاجرین کو کس ضلع میں کتنی تعداد میں آباد کیا جائے اور کہاں کہاں کھپایا جائے۔ اس سلسلے میں تمام وزراء نے ایک ایک ضلع کی ذمہ داری اٹھائی، وہ دو ہفتوں کے اندر وہاں جاکر مسلمان زمینداروں اور مسلم لیگ کے عہدیداروں سے صلاح مشورہ کریں گے۔ اُس کے بعد صوبائی مسلم لیگ کو حقائق سے آگاہ کریں گے۔" (ترجمہ)

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے سندھ مسلم لیگ نے اپنے ۱۹۳۸ء کے سالانہ اجلاس میں مسلم قومیت کی بنیاد پر علیحدہ وطن کے مطالبے پر غور شروع کر دیا تھا۔ آج وہ لوگ جو سندھ کو متعصب ہونے کا طعنہ دیتے ہیں۔ اُنہیں یہ بھی سوچنا چاہیئے کہ سندھی فکر میں تبدیلی اُس صورتِ حال نے پیدا کی جو پاکستان کے قیام کے بعد پیدا ہوئی۔ یعنی بہت بڑی تعداد میں غیر سندھیوں کی سندھ میں نقل مکانی اور آباد کاری۔ نئے آنے والے ایک گروہ نے خود کو مقامی تہذیب سے الگ رکھا بلکہ اپنی زبان اُن پر مسلط کرنے کی کوشش کی۔ اور پھر نئے آنے والے بہت سے لوگ سندھ میں آکر معاشی اعتبار سے خوشحال ہوگئے۔ جبکہ سندھ کی پرانی مسلم آبادی بدستور دیہاتوں میں پسماندگی کا شکار رہی۔ ہمارے حکمران یہ مسئلہ نہ سمجھ سکے کہ برِصغیر کا بڑا تضاد جو ہندو مسلم مفادات کی صورت میں موجود تھا پاکستان کے قیام کے بعد ختم ہوگیا۔ اُس کے بعد نیا تضاد جو صنعتی اور شہروں کی ترقی نے پیدا کیا، وہ سندھ کے مخصوص حالات میں لسانی گروہوں کے مسائل کی شکل میں ظاہر ہوا۔ حکمران اِن مسائل کو سمجھنے اور حل کرنے کی صلاحیت سے عاری تھے۔ مزید برآں صنعتی ترقی اور جدیدیت کے عمل نے روایتی سوچ میں تبدیلی پیدا کی۔ دوسرے لسانی گروہوں کی طرح سندھی بولنے والے بھی گروہی مفاد کے رنگ میں سوچنے لگے۔ پانچویں دھائی کے وسط میں ہی سندھی قومیت کا احساس تقویت پانے لگا تھا۔ سندھی زبان کے اخبارات نے سندھی مفادات اور سندھی قومیت کی بھرپور وکالت شروع کر دی تھی۔ حوالے کے لئے روزنامہ "کاروان" حیدر آباد کے ۱۸ ستمبر ۱۹۵۳ کے شمارے کا اداریہ ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

ذیل میں ہم جناب محمد موسیٰ بھٹو کی تصنیف "مولانا جان محمد بھٹو کی شخصیت اور خدمات" کے صفحہ ۹۲ سے ایک طویل اقتباس نقل کرتے ہیں۔ اِس سے واضح ہوگا کہ سندھی بولنے والے سرکاری ملازمتوں سے اپنی محرومی کو کس شدت سے محسوس کرتے ہیں اور وہ پنجاب کی بالادستی اور ملک میں مروج نظریاتی نعروں کے بارے میں کیسے جذبات رکھتے ہیں۔

مولانا جان محمد بھٹو صاحب کو سندھ میں قوم پرستی کے بڑھتے ہوئے رجحان اور سندھی نوجوانوں کی اخلاقی اور مذہبی حالت پر بڑی تشویش اور اس کے سدھارنے و اصلاح کی بڑی فکر رہتی تھی۔ متعدد بار اُن سے اِس موضوع پر تفصیلی گفتگو ہوئی۔ ایک بار کہنے لگے "وہ کیا موقف اختیار کیا جائے۔ جس سے سندھی نوجوان ہماری بات سننے کے لئے آمادہ ہوں اور اسلام کی طرف متوجہ ہوں"۔ میری تجویز یہ تھی کہ سندھ کے ساتھ ملازمتوں اور زرعی زمینوں کی تقسیم میں جو ناانصافیاں ہوئی ہیں اور لاکھوں ایکڑ زمین پنجاب کے لوگوں میں تقسیم کی گئی ہے جبکہ مقامی لوگ زمینوں سے محروم ہیں۔ اِسی طرح ملازمتوں کا حال ہے۔ ۱۹۸۰ء کی رپورٹ کے مطابق مرکزی حکومت میں ملازمین کی کل تعداد ڈیڑھ لاکھ ہے۔ سندھ کا کوٹہ ۲۰ فیصد ہے۔ شہری آبادی کو جس میں کراچی، حیدر آباد اور سکھر آتے ہیں ۸ فیصد اور دیہاتی آبادی کو ۱۲ فیصد دیا گیا ہے۔ لیکن عملاً صورت حال یہ ہے کہ سندھ کے ۳۰ ہزار ملازمین میں سندھ کی دیہاتی آبادی کو چار ہزار ملازمین دیئے گئے ہیں۔ جن میں سندھی زبان بولنے والے بمشکل اڑھائی ہزار ہیں۔ یہ حکومت کے شائع شدہ اعداد و شمار ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ اِن ناانصافیوں کے ذمہ دار ہمارے پنجابی یا مہاجر بھائی نہیں ہیں بلکہ یہ اُس نظام کی کارستانی ہے جو یہاں نوکر شاہی نے تشکیل دیا ہے۔ نیز اُن ناانصافیوں کو بنیاد بنا کر وہ عناصر سندھی حقوق کے چیمپئن بن گئے ہیں جو اسلام اور پاکستان سے عداوت رکھتے ہیں۔ عام سندھی نوجوانوں کو ان لیڈروں اور دانشوروں کی اسلام دشمنی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ تو اُن کے گرد اِس لئے جمع ہوئے ہیں کہ یہ اُن کے حقوق و مفادات کی بات کرتے ہیں۔ اب اگر حقوق و مسائل کے سلسلے میں کوئی دوسرا پلیٹ فارم موجود ہو تو اس لیڈر شپ سے عام سندھی نوجوانوں کی وابستگی کو توڑا جا سکتا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ ہماری قیادت کو چاہیئے کہ وہ اِن حق تلفیوں کے خلاف جرأت کے ساتھ آواز بلند کرے اور یہ واضح کیا جائے کہ یہ جو کچھ ہوا۔ اُس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ اب حالات اس موڑ تک پہنچ گئے ہیں کہ حقوق کی آواز بلند کئے بغیر سندھی نوجوان تحریکِ اسلامی اور اسلام کے حوالے سے کوئی بات سننے کے لئے آمادہ نہ ہوں گے اور وہ پاکستان و اسلام سے دور تر ہوتے چلے جائیں گے۔ اِس لئے کہ بدقسمتی سے یہاں اسلام اور پاکستان کا نعرہ اُن لوگوں نے لگایا جو کسی سے بھی مخلص نہیں تھے۔ اُنہوں نے چھوٹے صوبوں پر اپنے ناجائز وجود کو مسلط کرنے کے لئے اسلام اور سالمیت کا نعرہ لگایا۔ اُن کے اسلام و پاکستان کا مطلب یہ تھا کہ پنجاب کے افسر شاہی طبقے کے لئے چھوٹے صوبوں میں تمام چھوٹی بڑی ملازمتیں محفوظ ہوں۔ اِن صوبوں کی زمین اُن کو الاٹ کی جائے اور اُن کی صنعتی و تجارتی زندگی اُن کی مٹھی میں رہے۔

"اُس افسر شاہی نے جس کا تعلق پنجاب سے ہے۔ اپنے مفادات کے لئے ایک نظام قائم کیا اور اُس کو اسلام و پاکستان کی مہر لگا کر پیش کیا۔ اِس لئے جب تک اِس جعلی اسلام کا پول نہ کھولا جائے اُس وقت تک سندھی نوجوان حقیقی اسلام کی بات سننے پر آمادہ نہ ہوں گے۔ مجھے یہ خطرہ ہے کہ حقوق و مسائل کے بارے میں خاموشی، سندھی نوجوانوں کو اسلام اور پاکستان کے مخالفین کے مزید قریب تر کر دے گی۔ مولانا نے غور سے میرا موقف سنا اور پھر کہا کہ آپ کا موقف صحیح ہے لیکن مسائل پر موقف اختیار کرنے اور اُسے پیش کرنے کے لئے کیا طریقۂ کار اختیار کیا جائے۔ میں نے عرض کیا کہ سندھ کے حقوق و مسائل پر حقائق و استدلال کے ساتھ ایک کتاب لائی جائے جس میں ایک ایک مسئلہ کے بارے میں واضح موقف اختیار کیا جائے اور خلفائے راشدین کے عہد سے نظیریں لے کر ثابت کیا جائے کہ اسلام کس طرح زرعی زمین اور دیگر حقوق کے معاملہ میں مقامی لوگوں کو اولیت دیتا ہے۔ پھر یہ کتاب یونیورسٹیوں اور کالجوں میں بڑے پیمانے پر تقسیم کی جائے"۔

مذکورہ گفتگو جناب محمد موسیٰ بھٹو ، رکن جماعت اسلامی اور مولانا جان محمد بھٹو نائب امیر جماعت اسلامی سندھ کے درمیان ہوئی ۔ یہ حضرات ایک ایسی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں جو زبان اور نسل کی بنیاد پر قوم کے وجود کے حامی نہیں اور علاقائی اور لسانی انداز فکر کو معیوب سمجھتی ہے اس گفتگو سے ظاہر ہوتا ہے کہ سندھ کی مادی حقیقتوں نے سندھ کے روایتی اسلامی حلقوں پر بھی کتنا گہرا اثر ڈالا ہے ۔ لسانی یکجہتی کی بنیاد پر سندھیوں کے حقوق کے مسئلے پر غور و خوض کرنا اہم فکری تبدیلی کی غمازی کرتا ہے جو اُن کی شدت احساس کا فطری نتیجہ ہے ۔

پاکستان ایک جغرافیائی وحدت ہے ، تاریخی اعتبار سے پاکستانی علاقے بارہا ایک دوسرے سے متحد رہے ہیں ۔ پاکستان کے سبھی علاقوں کی تہذیب پر مسلم عقائد عرب ایران اور وسطی ایشیا کے تمدنی اثرات ہیں ۔ منصفانہ انداز میں سب علاقوں کا معاشی اشتراک قومی اتحاد کو فروغ دے سکتا ہے ۔ تاہم یہ بات بھی صحیح ہے کہ ہمارے ہاں سب باشندوں اور علاقوں کی لسانی اور تہذیبی خصوصیات یکساں نہیں ۔ مگر یہ کوئی غیر فطری یا عجیب بات بھی نہیں ۔ بہت سے ملکوں میں تہذیبی رنگارنگی اور تنوع موجود ہوتا ہے ۔ ایسی رنگارنگی اور تنوع اس وقت تک کوئی سیاسی مسئلہ پیدا نہیں کرتے جب تک قوم میں مشترک مفاد ، سیاسی مفاہمت اور رواداری کا جذبہ موجود رہتا ہے ۔

پاکستان کے تمام علاقوں کے رہنے والے لوگ (سوائے معمولی اقلیت کے) اسلام سے وابستہ ہیں ۔ یہ وابستگی تاریخی اعتبار سے بڑی اہمیت کی حامل ہے ۔ مگر حالیہ تجربہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ عنصر آئندہ قومی مفاہمت بڑھانے کا موجب تبھی ہو سکتا ہے کہ مذہب کی اختلافی تاویلات سے گریز کیا جائے ۔ تاریخ گواہ ہے کہ باہمی سیاسی اتحاد نے مسلمانوں کو عروج بخشا ہے ۔ جبکہ مذہبی تاویلات کے اختلافات نے ہمیں تباہ کیا ہے ۔ ہمارا مذہب ہمارے سیاسی مستقبل پر کیا اثرات مرتب کرتا ہے ، اس کا تعلق اُن تاویلات سے ہے جو حالیہ دور میں جاری ہیں ۔ ہم مذہب ہونے کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ، مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ مشترک زبان اور تہذیب کے حامل پاکستانی شہری جو ایک ہی جگہ آباد ہیں ، اپنا اپنا خصوصی تہذیبی کیریکٹر بھی رکھتے ہیں ۔ مشترک تہذیب کے حامل افراد میں یقیناً گروہی مفاد اور اخوت کا فطری تعلق ہوتا ہے ۔ اِس حقیقت کو تسلیم کئے بغیر ہمارے قومی مسائل کا حل ممکن نہیں ۔

ہمارا ملک ایک ترقی پذیر ملک ہے ، جس کی تکنیکی صلاحیت اور معاشی وسائل پسماندہ ہیں ۔ تعلیم یافتہ افراد کی شرح کم ہے ، ابھی تک ہماری سوچ ، تمدن اور سیاسی زندگی پر قبائلی اور نیم قبائلی اثرات گہرے ہیں ۔ جمہوری روایات بھی پائیدار نہیں ۔ ایسا پس منظر جن مسائل کو پیدا کرتا ہے اُن سب سے ہم قومی سطح پر آج کل دوچار ہیں ۔ مشترک قومی مسائل کے علاوہ ہمارے معاشرے میں علاقائی قومیتوں کے خصوصی مسائل بھی پائے جاتے ہیں ۔ قومیتوں کا اہم مسئلہ ریاست کے اقتدارِ اعلیٰ میں شرکت ہوا کرتا ہے ۔ ہمارے مخصوص حالات میں اُن کی حقیقی شرکت سچے جمہوری وفاقی نظام ہی سے ممکن ہے ۔ آزادی سے پہلے آل انڈیا مسلم لیگ نے اور قیام پاکستان کے بعد تقریباً تمام سیاست دانوں نے ایک ایسے ہی نظام کی ضرورت پر اتفاق کیا ہے ۔ یہی شرکت متعدد زبانیں بولنے والوں اور مختلف علاقوں میں رہنے والوں کے درمیان یکجہتی کا احساس پیدا کرتی ہے اور وہ باہم مل بیٹھ کر مشترک مفاد کی خاطر قومی حکمتِ عملی طے کرتے ہیں ۔ اس طرح علاقائی مفادات مجموعی مفادات میں ضم ہو جاتے ہیں ۔ گویا جمہوری وفاق ہماری مسلمہ ضرورت ہے ۔ اسی بنا پر ہمارے ملک میں آمرانہ یا نیم آمرانہ طرزِ حکومت انتہائی غیر موزوں ہے ۔ ایسی حکومت مسائل حل کرنے کی بجائے ان میں اضافے کا باعث ہوتی ہے اور دوسرے صوبوں میں پنجاب کی بالادستی کی شکایت کا موقع فراہم کرتی ہے ،

جمہوریت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ وہ منظم گروہ ہے جو بظاہر قومی مفاد کے پیشِ نظر مگر اصلاً اپنے اقتدار کی خاطر، غیر نمائندہ یا نیم جمہوری نظام قائم کرنا چاہتا ہے جس میں طاقت انہیں حاصل رہے۔ افسوس یہ ہے کہ کچھ ایسے نظریاتی افراد بھی اُس کے ہمنوا ہیں جو اِس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ اُن کے مقاصد کی تکمیل آمرانہ حربوں ہی سے ممکن ہے۔ اگر پنجاب اِن گروہوں کے زیرِ اثر آ گیا تو وہ دوسرے صوبوں کے موثر گروہوں کی جمہوری سوچ سے کٹ جائے گا۔ مجھے اِس بارے میں کوئی شک نہیں کہ اگر ایسا ہوا تو دوسرے صوبوں میں بسنے والے بہت سے ہم وطن مرکز اور پنجاب سے دُور ہٹتے چلے جائیں گے۔ اِس طرح قوم میں نفاق پیدا ہو گا جو ہمارے قومی وجود کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ پاکستان کی تاریخ نے ہمیں بار ہا یہی سبق دیا ہے اور وہی سندھ کی اگست ۱۹۸۳ء کی تحریک نے ایک دفعہ پھر یاد دہانی کرائی ہے کہ ہمارا قومی اتحاد جمہوری وفاق کے استحکام کا مقتضی ہے۔ چنانچہ ایسا آئینی نظام یا کوئی ایسی نظریاتی تاویل یا اقدام جو جمہوریت کے تصوّر سے متصادم ہو، انجامِ کار ہمارے قومی وجود کے لئے زہر قاتل ثابت ہو گا۔

سندھ کے لسانی گروہ

قیامِ پاکستان کے وقت سندھ کی آبادی تقریباً ۵۲ لاکھ نفوس پر مشتمل تھی۔ کئی لاکھ ہندو بھارت نقل مکانی کر گئے اور بھارت سے کئی لاکھ مسلمان آکر سندھ میں آباد ہوئے۔ پاکستان میں پہلی بار مردم شماری ۱۹۵۱ء میں ہوئی اُس کے مطابق سندھ کی آبادی ۶۱ لاکھ تھی۔ ۱۹۸۱ء میں سندھ کی آبادی ایک کروڑ نوّے لاکھ ہوگئی۔ گویا ۱۹۵۱ء سے ۱۹۸۱ء تک سندھ کی آبادی میں ۳۱۰ فیصد اضافہ ہوا۔ جبکہ اِس دوران کل پاکستان کی آبادی میں اضافہ ۲۷۰ فیصد تھا۔ اِس سے ظاہر ہوا کہ گذشتہ تیس سالوں میں پاکستان کے دوسرے صوبوں سے صوبہ سندھ میں نقل مکانی جاری رہی۔ سندھ کے شہروں میں رہنے والی آبادی کی شرح ۱۹۵۱ء میں ۳۳،۳ فیصد تھی۔ جو ۱۹۷۲ء میں بڑھ کر ۴۰،۷ فیصد ہوگئی۔ بعد ازاں اِس میں مزید اضافہ ہوا۔ ۱۹۸۱ء میں یہ شرح تقریباً ۴۳ فیصد ہوچکی تھی۔ سندھیوں کی شکایت یہ ہے کہ انہیں سندھ میں اقلیت بنایا جارہا ہے۔

قیامِ پاکستان سے قبل سندھ کی ہندو آبادی کی اکثریت عام طور پر شہروں میں بستی تھی۔ صنعت، تجارت اور سرکاری و نجی ملازمتوں پر تقریباً تمام تر غیر مسلموں کا غلبہ تھا۔ ہندو آبادی کے تاجر اور ملازمت پیشہ افراد بڑے فعال تھے۔ اِس طبقے سے تعلق رکھنے والے متعدد افراد دور دور تک نقل مکانی کر کے تجارت اور ترقی یافتہ پیشے اختیار کر چکے تھے۔

اِس کے برعکس سندھ کی مسلمان آبادی دیہی علاقوں میں رہتی تھی اور تمام تر لوگ کاشتکاری کا پیشہ اختیار کئے ہوئے تھے۔ کاشتکاری کا طریقہ بہت پسماندہ تھا۔ چھوٹے کاشتکار اور ہاری غربت کی سطح پر زندگی بسر کرتے تھے۔ سندھ کی زراعت اور کلچر میں وڈیروں اور روحانی پیشواؤں کو اہم مقام حاصل تھا۔ تاریخی پس منظر کے طور پر یہ جاننا ضروری ہے کہ وڈیروں کی حیثیت بہ تمامی حکمرانوں کی سی تھی۔ اُن کی حکمرانی کے دو پہلو تھے۔ ایک جبر اور تشدد جس کی بنیاد پر وہ اپنی بالادستی قائم کرتے تھے۔ اور ہاریوں کے ذریعہ دولت کماتے تھے اور دوسرے پسماندہ ہاریوں کی دیکھ بھال جیسے کوئی رحم دل مالک اپنے ڈھور ڈنگر کی حفاظت کرتا تھا۔ ہاریوں کا زندگی کے بیشتر معاملات کا ان وڈیروں پر بہت انحصار تھا۔ ہاری وڈیرے کی زمین کاشت کرتا تھا۔ اسی کی زمین پر رہائش پذیر تھا۔ وہی اُس کے دُکھ درد اور علاج معالجے کا انتظام کرتا تھا۔ محکمہ مال اور پولیس کے حکام سے وابستہ تمام امور طے کراتا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ ہاری کے لئے وڈیرے

کے پاؤں چھونے ضروری تھے۔ روایتی طور پر وڈیرہ کاشتکاری کے معاملے میں جدید طریقے میں دلچسپی نہیں لیتا تھا اور پیداوار بڑھانے کے معاملے میں کوئی عملی کردار ادا نہ کرتا تھا۔ لیکن اُس کی زندگی کا طور طریقہ ایسا تھا جسے وہ عام طور پر اپنے وسائل سے پورا نہ کر سکتا تھا۔ چنانچہ وہ ہندو ساہوکار کا مقروض رہتا تھا۔ تاہم وڈیرے کی ٹھاٹھ باٹھ کی زندگی، ادب اور فنون لطیفہ سے دلچسپی اور روحانی پیشواؤں سے عقیدت اور بعض کی پسماندہ طبقات سے پدرانہ شفقت یہ تمام ایسی خصوصیات ہیں۔ جن کی بدولت سندھ کے مجموعی کلچر میں اُسے اہم مقام حاصل تھا۔ یہ سب خصوصیات انگریزوں کے ورود سندھ سے قبل چلی آ رہی تھیں۔ البتہ انگریزوں نے سندھی وڈیروں کی روائتی قبائلی طاقت میں سیاسی طاقت کے اضافے اور سرکاری حکام سے اُن کے تعلقات کو مستحکم بنا کر ایک طرح سے اُسے استبدادی طاقت بھی بنا دیا۔

قیام پاکستان کے بعد ہندو آبادی کی اکثریت نقل مکانی کر گئی اور یوں تجارت اور شہری آبادی کے پیشوں میں خلاء واقع ہوا۔ ہندوؤں کی جائیدادیں متروکہ قرار دے دی گئیں اور سرکاری ملازمتوں میں بھی خلاء پیدا ہوا۔

قیام پاکستان کے ابتدائی چند سالوں میں سندھ میں نقل مکانی کرنے والی آبادی کی اکثریت کا تعلق یوپی اور کسی حد تک سی پی سے تھا۔ سرکاری ملازمت پیشہ افراد جو یوپی سے آئے انہوں نے مرکزی اور صوبائی حکومت میں واقع ہونے والے خلاء کو پُر کیا اور ہندوؤں کی شہری جائیدادوں کی اکثریت بھی انہی مہاجرین کے حصے میں آئی۔

لسانی بنیادوں پر سندھ کی آبادی کی تفصیل موجود نہیں، البتہ پیشوں کے اعتبار سے اس کا سرسری جائزہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ گجراتی بولنے والے شہریوں کا تعلق تجارت، صنعت اور ملازمت سے ہے۔ اس گروہ نے سندھ کی صنعتی ترقی میں اہم رول ادا کیا۔ پٹھانوں کی اکثریت کا تعلق ڈرائیوری اور غیر ہنرمند ملازمتوں مثلاً تعمیراتی لیبر چپڑاسی، پہرہ داری سے ہے۔ پٹھانوں کی بھاری اکثریت کے اہل وعیال صوبہ سرحد یا قبائلی علاقے میں رہتے ہیں۔ جنہیں وہ متواتر گھر کا خرچہ ارسال کرتے رہتے ہیں۔ اُردو بولنے والے مہاجرین کا ایک حصہ سرکاری دفتروں اور صنعتوں میں ملازمت کرتا ہے۔ خوشحال طبقہ بڑے پیمانے کی تجارت اور چھوٹی صنعت میں اہمیت کا مالک ہے شہروں میں دکانداروں کی بھاری اکثریت بھی اسی طبقہ سے تعلق رکھتی ہے۔ یوپی سے منتقل ہو کر آنے والے کاریگروں نے سندھ کے شہروں میں سکونت اختیار کر کے گھریلو صنعتکاری کا آبائی پیشہ اختیار کر رکھا ہے۔

دیہی سندھ میں پنجابی کسانوں کا ایک حصہ قیام پاکستان سے قبل وہاں آباد ہو چکا تھا۔ جنہوں نے سندھ میں نہری آبپاشی کے فروغ کے بعد بنجر زمینوں کو آباد کیا اور اس طرح سندھ کی زرعی معیشت میں خوشحالی لانے میں اہم کردار ادا کیا۔ تاہم قیام پاکستان کے بعد بھی نئے بیراج قائم ہونے پر کئی ہزار خاندان پنجاب سے سندھ میں نقل مکانی کر گئے۔ پنجابی آباد کار زیادہ تر نواب شاہ، تھرپارکر، حیدرآباد، بدین، ٹھٹھہ اور سکھر کے اضلاع میں آباد ہیں۔ علاوہ ازیں پنجابی بولنے والے بڑے شہروں میں دکانداری اور چھوٹی موٹی تجارت میں بھی مصروف ہیں بڑے تجارتی کاروبار اور صنعتوں میں چنیوٹی شیوخ کا مؤثر حصہ ہے۔ پنجابی بولنے والے متوسط طبقہ کے تعلیم یافتہ افراد آزاد پیشوں اور سرکاری اور نجی ملازمتوں میں مہاجروں کے ساتھ شریک ہیں۔ پنجابی مزدور طبقہ صنعتی لیبر کے طور پر کام کر رہا ہے۔

سندھی بولنے والوں کی بھاری اکثریت دیہات میں آباد ہے۔ دیہی علاقوں میں چند کارخانوں کے سوا

کوئی قابل ذکر صنعتیں نہیں۔ چند شوگر ملیں اور فرٹیلائزر کے کارخانے جو سرکاری شعبوں میں نصب ہوئے۔ اُن کے اعلیٰ منتظمین اور بیشتر مزدوروں کا تعلق پنجابی بولنے والوں سے ہے۔ اِس بارے میں دیہی سندھ میں شکایت زبان زد عوام وخواص ہے۔ میں نے اپنے دورہ سندھ کے دوران دیکھا کہ دیہی علاقوں کی صنعتوں میں کام کرنے والے چند ہزار پنجابی کراچی کی لکھو کھہا غیر سندھی لیبر فورس کے مقابلے میں کہیں زیادہ شکوہ وشکایت کا سبب بنے ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دیہی علاقے میں سندھی بولنے والوں کی بھاری اکثریت ہے جن کے پڑھے لکھے نوجوان بیروزگار ہیں۔

سندھ کے پرانے مسلم باشندوں میں چونکہ تجارت کی کوئی روایت نہ تھی۔ اِس لئے اُنہوں نے ملک کی صنعتی سرمایہ کاری میں کوئی رول ادا نہ کیا۔ سینتیس سال گزرنے کے بعد بھی صنعتکاری میں دلچسپی لینے والے پرانے سندھیوں کی تعداد بہت تھوڑی ہے۔ کراچی سٹاک ایکسچینج کی لسٹ میں شامل کمپنیوں کے ڈائریکٹروں کی کل تعداد میں سندھی بولنے والے ڈائریکٹر ایک فیصد سے بھی کم ہیں۔ تکنیکی ماہرین اور منتظمین کا تعلق بھی دیہی سندھ سے نہیں۔ صنعتی لیبر بھی اندرون سندھ سے میسر نہیں ہوتی۔

بعض حلقوں کی طرف سے سندھی بولنے والوں کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ پولیس اور فوج میں بھرتی ہونا پسند نہیں کرتے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ سُست اور کاہل ہیں۔ اور کچھ افراد بھنگ اور افیون کے عادی ہیں۔ اُن کے پسماندہ رہنے کی وجوہ بھی یہی تصوّر کی جاتی ہیں۔ اگرچہ بھنگ اور افیون کے بارے میں الزام لگانے والے بھی یہ نہیں کہتے کہ سندھیوں کی بھاری اکثریت ایسے نشوں کی عادی ہے۔ تاہم ہم نے اس سلسلے میں جو معلومات حاصل کی ہیں۔ ہم اُنہیں پنجاب کے ساتھ ایک تقابل کی شکل میں پیش کرتے ہیں،

جس وقت پنجاب پر انگریزوں نے اپنا تسلط قائم کیا تو یہاں سکھوں کی حکمرانی تھی۔ جس سے مسلمان سخت بیزار اور شاکی تھے۔ چنانچہ اُنہوں نے انگریزوں کی آمد کو سکھوں کے مقابلے میں بہتر گردانا اور اُنہیں اپنا نجات دہندہ سمجھا۔ اِس کے برعکس سندھ میں جب انگریز راج قائم ہوا تو وہاں مسلم تالپور خاندان کے افراد حکمران تھے، چنانچہ سندھیوں نے مسلمان حکمرانوں کی جگہ انگریز حکومت کو تہہِ دل سے قبول نہ کیا۔ سندھ میں انگریز نجات دہندہ کی بجائے ناپسندیدہ، غیر مذہب اور غیر ملکی حکمران تھے۔ اِسی لئے سندھیوں کو انگریز کی ملازمت اور خصوصیت سے فوج اور پولیس کی ملازمت منظور نہ تھی۔ انگریز نے اپنا تسلط قائم رکھنے کے لئے وڈیروں سے تعلقات بہتر بنائے اور اُن کے اختیارات میں توسیع کی۔

سندھ کے بارے میں معترضین بخصوصیات یا شکایتیں بیان کرتے ہیں۔ ان کی تفصیل اور توجیہہ سندھ یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ کے ایک پروفیسر ڈاکٹر مبارک علی نے ایک رسالہ جس کا نام "سندھ کی تاریخ کیسے لکھی جانی چاہیئے" میں بڑی وضاحت سے بیان کی ہے۔ اس کا ایک متعلقہ حصّہ ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

"آیئے اب ہم اِن چند اعتراضات کی جانب اشارہ کرتے ہیں جو سندھ کے معاشرے پر کئے جاتے ہیں۔ مثلاً برطانوی مؤرخین، سیاحین اور منتظمین نے سندھ کے عوام کے بارے میں جو رائے دی ہے وہ یہ ہے کہ سندھی عوام کاہل، سُست، کام چور اور نکمے ہیں۔ یہاں نشہ کا رواج بہت ہے۔ اِسی وجہ سے سندھ جیسا زرخیز ملک ترقی نہیں کر سکا۔ اور پسماندگی کا شکار رہا۔ ایک مؤرخ کی حیثیت سے جو کچھ سندھ کے عوام کے بارے میں کہا گیا ہے اس کے تجزیہ کی ضرورت ہے۔ اس کی ابتداء ہم اس طرح سے کرتے ہیں کہ کوئی قوم پیدائشی یا فطری طور پر سُست اور کُند ذہن نہیں ہوتی اور نہ ہی محنتی اور ذہین۔ اس کی یہ خصوصیات ماحول اور نظام کی پیداوار ہوتی ہیں۔ جس قسم کا

سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظام ہوگا۔ اس کے نتیجہ میں اسی قسم کے افراد پیدا ہوں گے۔ اِس اُصول کی رشنی میں جب ہم سندھ کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات واضح ہوکر ہمارے سامنے آتی ہے کہ سندھ میں صدیوں سے نظام جاگیرداری اور زمینداری رہا۔ نظام جاگیرداری میں تمام مراعات صرف ایک طبقہ کو میسر تھیں۔ جبکہ آبادی کی اکثریت جو کسانوں اور محنت کش طبقہ کی تھی۔ اُنہیں گزارے کے لئے مشکل سے کچھ ملتا تھا۔ اِس لئے جب یہ استحصالی نظام اپنے عروج پر پہنچا اور آبادی کی اکثریت کو اُس کی محنت کا صلہ نہ ملا تو ظاہر ہے کہ اُسے محنت اور کام میں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی اور آہستہ آہستہ کام سے اس کی بیگانگی بڑھتی گئی اور اُس کی جگہ سُستی و کاہلی نے لے لی۔ جب زندگی میں محرومیاں بڑھیں تو اُس سے فرار کا راستہ یا تو نشہ میں ڈھونڈا یا مزاروں کی زیارت اور نذر نیاز میں پناہ لی۔

"اِسی طرح جب جاگیردار طبقہ کے پاس بلا محنت کئے دولت کی فراوانی ہوئی تو اُس میں عیاشی و کاہلی پیدا ہوئی معاشرے کو تبدیل کرنے یا اُس میں انقلاب لانے کا تصور ایسے معاشرہ میں ناممکن ہو جاتا ہے۔ اِسی لئے سندھ کا معاشرہ ایک جگہ منجمد ہو گیا اور اُس میں کسی قسم کی ترقی نہیں ہوئی۔

"دوسرا اعتراض جو سندھ کے معاشرے پر کیا جاتا ہے اُس کی نوعیت بھی پہلے اعتراض جیسی ہے۔ یعنی سندھ اِس لئے مظلوم رہا اور یہاں اِس لئے غیر ملکی حملہ آور کامیاب ہوئے کیونکہ سندھی جنگجو قوم نہیں۔ دراصل کوئی قوم پیدائشی جنگجو نہیں ہوتی۔ اس کا تعلق بھی ماحول سے ہے جو قوموں کو پُرامن یا لڑاکر رکھتا ہے۔ سندھ پر غیر ملکی فاتحوں کی وجہ یہ نہ تھی کہ سندھ کے عوام جنگجو نہ تھے۔ بلکہ اِس کی وجہ یہ تھی کہ نظام جاگیرداری میں اُن کی معاشرے میں کوئی وقعت اور حیثیت نہ تھی۔ اِس لئے ایک ایسے معاشرے میں جہاں اُن کے مفادات کا کوئی تحفظ نہ ہو وہ ایسے معاشرے کا دفاع کیوں کرتے۔ دفاع ہمیشہ جائیداد، مراعات اور حقوق کا کیا جاتا ہے۔ جو طبقہ اِن سب سے محروم ہو وہ کس لئے اور کیوں لڑے؟ اور کس کی خاطر اپنی جان قربان کرے؟ اِسی وجہ سے اس جاگیردارانہ معاشرے میں جنگ کا کام حکمران طبقہ اور اُن کی تنخواہ دار فوج کا ہوا کرتا تھا۔ یہ وہ وجوہات تھیں کہ جن کی وجہ سے سندھ بار بار غیر ملکی طاقتوں کا محکوم ہوا۔"

مگر یہ سب گزرے ہوئے زمانے کی باتیں ہیں۔ اِس لئے آج یہ کہنا غلط ہے کہ سندھیوں میں ترقی کا جذبہ موجود نہیں یا یہ کہ اُنہیں سرکاری ملازمتوں بشمول پولیس اور فوج میں بھرتی ہونے سے انکار ہے۔ آج اندرون سندھ میں یہ احساس بدرجہ اتم پایا جاتا ہے کہ وہ معیشت اور ریاست کے تمام شعبوں میں بھرپور رول ادا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ایک خوش آئند جذبہ ہے۔ جس جوش و خروش سے سندھی بولنے والے اپنی صنعتی پسماندگی کا ذکر کرتے ہیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ اِس معاملے میں اب وہ کسی اور سے پیچھے رہ جانا قبول کریں گے۔ اہم سندھی رہنماجن کا تعلق عام طور پر بڑے بڑے زمیندار خاندانوں سے ہے۔ سندھ کے لئے یہی مطالبہ پورے جذبے سے پیش کر رہے ہیں۔ توقع کرنی چاہیئے کہ اب وہ دیہی علاقوں میں صنعتی ترقی کے عمل میں اہم کردار ادا کریں گے۔ پنجاب میں متعدد بڑے زمینداروں نے صنعتی شعبہ میں دلچسپی لینا شروع کر رکھی ہے۔ متعدد بڑے سندھی زمیندار یقیناً اتنے بنیادی سرمائے کے مالک ہیں کہ وہ سرمایہ کاری کے بینکوں سے قرضہ حاصل کر کے صنعتیں نصب کر سکیں۔ دورہ سندھ کے دوران ایک بڑے زمیندار نے شکایت

کی کہ صنعتوں کی تنصیب کے لئے اُن کی درخواست پر پُرانے صنعتکاروں کو فوقیت دی گئی۔ اِس طرح گویا پُرانے سندھیوں کو صنعتوں کے شعبے سے دُور رکھنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ہمارے خیال میں دیہی علاقوں میں نئی صنعتوں کی تنصیب کے لئے پرانے سندھیوں کی درخواستوں کو ترجیحی سلوک ملنا چاہیئے۔ اِس سے یقیناً سندھ کی سیاست میں دو مؤثر گروہوں کو مطمئن کیا جاسکتا ہے۔ ایک وہ جو سندھ کے دولت مند خاندان ہیں جنہیں صوبے کی سیاست میں اہم مقام حاصل ہے۔ اور دوسرے دیہی علاقوں میں تعلیم یافتہ بیروزگار نوجوان جنہیں شہری علاقوں میں ملازمتوں کے حصول میں دشواری پیش آتی ہے۔ اِن دو طبقات کی شکایات کو دور کئے بغیر سندھ کی سماجی اور سیاسی زندگی میں استحکام کی توقع عبث ہے۔ سندھی سرمایہ کار صنعتی انتظام کے معاملے میں مہارت اور تجربے کی کمی کو ماہرین یا مشیر ملازمین سے پورا کرسکتے ہیں۔ اِس صورت میں ایسے ماہرین اور مشیروں کے غیر سندھی ہونے پر اعتراض کا امکان بھی نہ ہوگا۔

اِس ضمن میں ہم یہ بھی تجویز کریں گے کہ صنعتی اور تجارتی فنون کی تربیت کے لئے دیہی سندھ کے نوجوانوں کو خصوصی تربیت دی جائے۔ کوئی وجہ نہیں کہ اِن اقدامات سے دیہی سندھ کی معاشی نوعیت کی شکایات محدود مدت میں دُور نہ کی جاسکیں۔

قیام پاکستان کے بعد کراچی نے پورے ملک میں جدیدیت کے عمل میں رہنما کردار ادا کیا۔ کراچی میں بڑے بڑے کارخانے نصب ہوئے۔ جدید ٹیکنالوجی کا رواج ہوا۔ اندرونِ سندھ میں بھی نئی سڑکیں تعمیر ہوئیں۔ نئے بیراج بنے، پنجابی آبادکاروں نے زراعت کو ترقی دینے میں نمایاں رول ادا کیا۔ ریڈیو اور ٹیلیویژن نے دیہی علاقوں میں قناعت پسند سندھیوں کے ذہن میں ترقی کی ایک نئی لہر پھونکی۔ امارت اور غربت کے تضادات نے غریب باریوں میں بھی اپنی خوشحالی کے لئے پوشیدہ خواہشوں کو اُبھارا۔ لیکن سندھ کے مخصوص حالات میں ترقی کے ثمرات کا بیشتر حصّہ اُن افراد کے حصے میں آیا۔ جو سندھی بولنے والے نہ تھے۔ اِس لئے قدرتی طور پر سندھ میں طبقاتی تضادات کی بجائے لسانی تفریق کی بنیاد پر اُبھرنے والے تضادات نے تقویت پائی۔

لاڑکانہ کے ایک پرانے کمیونسٹ جناب سوبھوگیان چندانی نے اِس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ سوشلسٹوں کے زیر اثر چلنے والی ہاری تحریک سندھ میں تمام کوششوں کے باوجود کوئی اہم مقام حاصل نہ کرسکی۔ مگر اِس کے برعکس سندھ عوامی تحریک جس نے وڈیروں کے علاوہ پنجابی آبادکاروں کے خلاف مقامی باریوں کو منظم کرنے کی کوشش کی وہ کہیں زیادہ مؤثر ثابت ہوئی۔ اِسی جماعت کے کارکنوں نے تحریک سول نافرمانی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

ہمارے مشاہدے کے مطابق سندھ کے دیہات میں اصل اہمیت ابھی تک پیپلز پارٹی کے رہنماؤں کو حاصل ہے۔ پیپلز پارٹی کے مؤثر رہنماؤں سے ملاقات کے بعد ہم نے محسوس کیا کہ پنجابی آبادکاروں کے بارے میں اُن کا رویہ روادارانہ ہے۔ مگر جہاں تک عام دیہی سندھیوں کا تعلق ہے اُن کے بارے میں یہ بات نہیں کہی جاسکتی۔ نومبر ۱۹۸۲ء میں ہم متعدد مقامات پر پنجابی آبادکاروں سے ملے۔ وہ شکایت کرتے تھے کہ سندھی بولنے والے علی الاعلان دھمکیاں دیتے ہیں کہ آبادکردہ زمینوں سے بیدخل کرکے وہ اُن پر قبضہ کرلیں گے۔

عام پنجابی بولنے والے کا شکار اپنی جان و مال کو غیر محفوظ تصور کرتے تھے۔

یہی حال اُردو بولنے والے مہاجرین کا ہے۔ وہ بھی غیر محفوظ اور اپنے مستقبل کے بارے میں تشویش کا اظہار کرتے ہیں۔ مگر اُن کی شکایتیں محض سندھی بولنے والوں تک محدود نہیں۔ بلکہ پنجابی بولنے والوں کے بارے میں بھی ہیں۔ اِس طرح جہاں تک پنجابیوں کا تعلق ہے اُن کے متعلق سندھی بولنے والے اور اُردو بولنے والے دونوں گروہ شکوہ کرتے ہیں۔ البتہ تحریک سول نافرمانی کے دوران اُردو اور پنجابی بولنے والے دونوں گروہوں کے افراد نے اپنے تئیں غیر محفوظ محسوس کیا۔ اور فوج کی امن و امان کے قیام کی کوششوں کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔ اِس کے برعکس سندھی بولنے والوں کی بھاری اکثریت مارشل لاء کے نفاذ، ذوالفقار علی بھٹو کی سزائے موت اور تحریک سول نافرمانی کے دوران فوجی کاروائی کو عام طور پر بڑے دکھ کے ساتھ یاد کرتی ہے۔ ہم نے نومبر ۱۹۸۳ء میں دیہی سندھ کے دورہ کے دوران متعدد مقامات پر عام سندھی بولنے والے افراد سے گفتگو کی۔ معلوم ہوا کہ اُردو تقریباً تمام سندھی سمجھ اور بول سکتے ہیں۔ ہم نے یہ بھی محسوس کیا کہ وہ سب کے سب پنجابی حکمرانوں اور پنجاب کے سیاسی تسلط کے بارے میں دُکھوں اور شکایتوں سے لبریز ہیں۔ امن و امان بحال کرنے والے اداروں نے جو بھی کاروائی کی۔ اُس کے لئے وہ عام پنجابی کو بھی ذمہ دار سمجھتے ہیں۔ کئی بار میرے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے عام سندھی نے شکایت کی کہ ایجی ٹیشن کے دوران فائرنگ سے جاں بحق ہونے والے سندھیوں کی موت کی ذمہ داری راقم پر بھی عائد ہوتی ہے محض اسلئے کہ اس کا تعلق پنجاب سے ہے۔ دیہی سندھ میں ہم نے متعدد بار یہ شکوہ سُنا کہ پنجابی سندھ پر حاکم ہیں۔ عام سندھیوں سے گفتگو کرتے ہوئے ہم نے یہ کہیں بھی نہ سُنا کہ ایجی ٹیشن کے دوران سندھی مظاہرین کی طرف سے کوئی بھی ایسی حرکت سرزد ہوئی ہو جس کی بناء پر امن بحال کرنے والے اداروں کو گولی چلانے پر مجبور ہونا پڑا۔ بلکہ ہر جگہ یہی شکایت سُننے میں آئی کہ سندھیوں پر ظلم کئے گئے ہیں۔

جہاں تک دیہی سندھ میں امن و امان کی بگڑی ہوئی صورتحال کا تعلق ہے۔ نومبر ۱۹۸۳ء کے دورے کے دوران ہم نے صرف چند افراد سے سنا کہ سندھ میں ڈاکوؤں کا بھی کوئی مسئلہ ہے۔ عام سندھی طنزاً کہتے کہ سندھیوں کو چور اور ڈاکو کے القاب سے نوازا جاتا ہے چنانچہ اگر کہیں فی الواقع ڈاکوؤں کے خلاف کاروائی ہوئی تب بھی عام سندھی کی نظر میں اُسے ایک لسانی اور سیاسی مسئلہ سمجھا گیا۔ بعض صاحب اثر حلقوں نے ہم سے یہ بھی کہا کہ تحریک کے بعد سندھی ملزموں کے خلاف قانون نافذ کرنے والے اداروں کے ہر اقدام کو سیاسی پس منظر سے جُدا نہیں کیا جا سکتا۔ اِس موقع پر شاید تاریخ کا یہ لطیفہ بیان کرنا بے جا نہ ہو کہ چیانگ کائی شیک کے پراپیگنڈے کے زیر اثر امریکی بیس برس تک یہی سمجھتے رہے کہ ماؤزے تنگ اور اُن کے ساتھی ڈاکوؤں کا گروہ ہیں۔

اپنے دوسرے اور تیسرے دورے کے دوران میں نے سندھ میں آباد مختلف لسانی گروہوں میں یکجہتی کو فروغ دینے کے لئے جاری کاوشوں کو اپنے خصوصی مطالعے کا موضوع بنایا۔ میں نے محسوس کیا کہ کراچی میں رہنے والے دوسرے لسانی گروہ سندھی زبان بولنے والوں کے ساتھ یکجہتی کا بہتر احساس رکھتے ہیں۔ کراچی کے مہاجر رہنماؤں میں یہ احساس اُبھر رہا ہے کہ اُنہیں سندھی زبان بولنے والی آبادی کے ساتھ ثقافتی یگانگت کی جانب پیش رفت کرنی چاہیئے۔ کراچی میں آباد مہاجروں کا سندھی زبان بولنے والوں کے ساتھ معاشی معاملات

میں کوئی اہم تضاد نہیں پایا جاتا۔ فی الواقع یہ تضاد اُن پنجابیوں اور پٹھانوں کے ساتھ ہے جو ملازمت اور کاروبار کی تلاش میں کراچی آرہے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ سندھی اور اُردو بولنے والے رہنماؤں میں اُن معاملات پر تبادلہ خیال ہو رہا ہے کہ دوسرے صوبوں کی جانب سے سندھ میں آبادی کا جو انتقال جاری ہے اُس کے معاشی اور سیاسی اثرات سے کیسے محفوظ رہا جائے۔ مثلاً اُن کے مابین اِس مسئلے پر غور جاری ہے کہ حالیہ دَور میں نقل مکانی کرکے آنے والے افراد کو سندھ میں ووٹ دینے کا حق نہ دیا جائے۔ اِسی طرح اُنہیں صوبے کے زیرِ انتظام سرکاری ملازمتیں بھی نہ دی جائیں۔ اِس مقصد کے لئے "سندھی" کی تعریف متعین کی جارہی ہے۔ ایک مجوزہ تعریف کے مطابق جو شخص سندھ سے دولت کما کر صوبے سے باہر منتقل کرے اُسے "سندھی" شمار نہ کیا جائے۔

اِس کے برعکس میں نے دیکھا کہ جو مہاجر حیدر آباد، سکھر اور اندرون سندھ کے دوسرے شہروں میں رہتے ہیں، وہ صورتِ حال کو ایک دوسرے انداز سے دیکھتے ہیں۔ اِن شہروں میں آباد مہاجروں اور دوسری طرف پنجابیوں اور پٹھانوں کے باہمی مفادات میں کوئی نمایاں تضاد نہیں۔ کیونکہ اِن شہروں میں پنجاب یا سرحد سے کوئی قابلِ ذکر انتقالِ آبادی نہیں ہو رہا۔ میں نے دیکھا کہ یہاں پر آباد مہاجر اب بچوں کے تعلیمی اداروں میں داخلے اور سرکاری شعبے میں ملازمتوں کے معاملات میں زیادہ شاکی ہیں۔ اُن کی شکایت یہ تھی کہ گذشتہ چند سالوں میں متوسط اور اونچے گریڈوں کی سرکاری ملازمتوں پر سندھی بولنے والے افراد کی مؤثر طاقت بن گئی ہے۔ چنانچہ اَب اُردو بولنے والی آبادی کئی مسائل سے دوچار ہے۔ اُن کا مطالبہ تھا کہ ملازمتوں کی تقسیم میں کوٹہ سسٹم کا اطلاق سرکاری ملازمتوں پر مجموعی طور پر نہیں بلکہ ہر گریڈ کی ملازمتوں پر علیحدہ علیحدہ ہونا چاہیئے۔

اندرون سندھ میں آباد مہاجر پٹھان اور پنجابی کم از کم سیاسی معاملات پر یکساں سوچتے ہیں۔ اُن کے لئے سندھ میں پیپلز پارٹی کے دور کی یادیں چنداں خوشگوار نہیں۔ یہ لوگ اپنے آپ کو مارشل لاء کے دور میں زیادہ محفوظ محسوس کرتے تھے۔ یوں لگتا ہے کہ وہ جمہوری نظام کے بارے میں کچھ ذہنی تحفظ رکھتے ہیں اور جب ۱۹ دسمبر ۱۹۸۴ء کو جنرل ضیاء الحق نے ریفرنڈم کے ذریعے مزید پانچ سال کے لئے اقتدار طلب کیا تو اُنہیں ذہنی سکون حاصل ہوا۔ اِس کا اظہار اُس پبلک جلسے کی کارروائی سے ہوتا ہے جو حیدر آباد میں میلاد النبی کے موقع پر منعقد ہوا۔ جس میں مہاجرین نے بڑی تعداد میں شرکت کی اور شاہ فرید الحق کی جانب سے ریفرنڈم کی مخالفت کو ناپسند کیا۔

خیال رہے کہ اِس سے کچھ عرصہ پہلے اندرون سندھ میں مہاجروں اور سندھیوں کے مابین یکجہتی کے فروغ کے لئے کچھ کاوشیں شروع ہوئی تھیں جو سرد ست ابتدائی مرحلے میں ہی تھیں کہ ریفرنڈم کی وجہ سے صدمے سے دوچار ہو گئیں۔ تاہم ریفرنڈم کے حوالے سے میں نے مشاہدہ کیا کہ سندھی دانشور غیر ملکی خبر رساں ایجنسیوں کی اُن خبروں پر خوشی کا اظہار کر رہے تھے کہ پنجاب اور سرحد کے عام لوگوں نے بھی ریفرنڈم کے بارے میں تقریباً وہی رویہ اختیار کیا جو عام سندھی بولنے والوں نے کیا۔ گویا اُنہوں نے اطمینان محسوس کیا کہ پاکستان کے تمام صوبوں کے لوگ موجودہ ملکی سیاسی صورتحال کے بارے میں ایک ہی انداز میں سوچتے ہیں۔

اب ہم پنجاب سے بیزاری کی اُس لہر کا خصوصی ذکر کریں گے جو سندھیوں میں بالعموم پائی جاتی ہے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا قیامِ پاکستان سے قبل سندھی مسلمانوں کے مفادات کا ٹکراؤ مقامی ہندوؤں سے تھا۔ پاکستان بننے کے بعد سندھی عوام کی شکایات بھارت سے آنے والے مہاجرین اور بالخصوص اُردو بولنے والے مہاجرین

کی وجہ سے پیدا ہوئیں۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پنجاب سے بیزاری کی لہر نے دوسری تمام شکایات اور تضادات کو پس پشت ڈال دیا۔ یہ تلخ صورت حال یکایک پیدا نہیں ہوئی۔ اِس کا ایک طویل تاریخی پس منظر ہے، جس کا قبل ازیں ذکر ہو چکا ہے، موجودہ صورت حال کو سمجھنے کے لئے صرف اِتنا بتانا ضروری ہے کہ سندھ میں پنجاب کے خلاف جذبات اُس وقت بھڑکے جب سندھ کے عوام کی مرضی کے خلاف ون یونٹ قائم کیا گیا اور سندھ کا علیحدہ وجود گم ہو گیا۔ یہ صورت حال سندھیوں کو بالکل قابلِ قبول نہ تھی چنانچہ تھوڑے ہی عرصے کے بعد سندھ اور دوسرے تمام صوبوں کے نمائندوں نے جن میں پنجاب کے نمائندے بھی شامل تھے یہ فیصلہ کیا کہ ون یونٹ کو ختم کیا جائے، لیکن جنرل ایوب خاں نے مارشل لاء کے نفاذ کے ذریعے ون یونٹ کو قائم رکھا۔ اِس طرح سندھ میں سندھی قومیت پرستی کے رجحانات کو تقویت حاصل ہونے لگی۔ ون یونٹ کے دوران بہت سے پنجابی آباد کار سندھ کے نئے بیراجوں کی اراضی پر آباد ہوئے۔ یہ اراضی سول اور فوجی اعلیٰ افسروں کو بھی الاٹ کی گئی۔ ون یونٹ کا دارالحکومت لاہور بنا۔ تمام چھوٹے صوبوں میں ون یونٹ کے قیام کے دوران جو انتظامی نوعیت کی مشکلات پیش آئیں۔ اُن کی وجہ سے پنجاب کے بارے میں مغائرت کا احساس اُبھرنا شروع ہوا۔ ۱۹۷۰ء کے الیکشن میں پیپلز پارٹی کی پنجاب میں کامیابی ایک ایسا عنصر بنی جس سے پنجاب اور سندھ کے عوام میں مغائرت کا بڑھتا ہوا جذبہ کم ہوا۔ لیکن ۱۹۷۷ء میں مارشل لاء کے نفاذ کے بعد مغائرت کے احساس میں اضافہ ہوا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ سندھ کے نمائندے فوجی حکومت میں بااختیار حیثیت سے شریک نہ تھے۔ مگر اس سے بھی زیادہ اہم مسئلہ فوج میں سندھ کی موثر نمائندگی نہ ہونے کا ہے۔ دوسری بات یہ کہ مارشل لاء کا دور طویل تر ہو گیا۔ تیسرے یہ کہ دوسرے صوبوں سے سندھ میں نقل مکانی جاری رہی علاوہ ازیں پنجاب میں سندھی عوام کی شکایات کے بارے میں حسب توقع افہام وتفہیم کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکی۔ اِس طرح مغائرت کا احساس نمایاں تر ہو گیا۔ اب صورت یہ ہے کہ سندھ کا باشعور طبقہ پنجاب کے دانشوروں کی یہ دلیل قبول کرنے کو تیار نہیں کہ پنجاب کے عوام اِن شکایات کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ اُن کے خیال میں پنجاب کے عوام کو اِن شکایات سے بری الذمہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ سندھیوں کا کہنا ہے کہ عام پنجابی کو موجودہ نظام سے فائدہ پہنچا ہے۔ جبکہ سندھی عوام کو اِس سے شکایتیں پیدا ہوئیں ہیں۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ سندھ کے باشعور لوگ اپنے موقف کے خلاف کسی بھی دلیل سے متاثر نہیں ہوتے۔ اُن کا مجموعی رویہ اب جذباتی ہو چکا ہے۔ حالیہ دورہ کے دوران میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ سماجی اور انتظامی نوعیت کی برائیاں جن کا تعلق حقیقت میں مروج معاشی اور انتظامی نظام سے ہے اُن کے لئے بھی پنجاب ہی کو ہدف تنقید بنایا جاتا ہے یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ سندھی عوام اِس نفسیاتی کیفیت میں کیسے مبتلا ہوئے مگر مجھے تشویش اس بات پر ہے کہ ایسی کیفیت میں معاملات کو سلجھانا کیوں کر ممکن ہو گا۔ میری رائے میں سندھ میں موجودہ نفسیاتی کیفیت کا تقاضا ہے کہ پنجاب سے باشعور مگر حوصلہ مند دانشور سندھ کا بار بار دورہ کریں۔ اِس سے یقیناً افہام وتفہیم کی فضا پیدا کرنے میں مدد ملے گی۔ مگر اِس سے یہ مُراد نہ لی جائے کہ ایک غیر نمائندہ یا نیم جمہوری طرز حکومت کے باوجود دانشوروں کی سطح پر کوششیں بار آور ثابت ہوں گی۔ لیکن چونکہ میں عوام کی سطح پر تعلقات کے فروغ کا حامی ہوں اِس لئے میں نے وفود کے دوروں کی تجویز پیش کی ہے۔ تاہم یہ حقیقت اپنی جگہ پر تسلیم شدہ ہے کہ اگر سیاسی

نظام نے مشکلات میں اضافہ جاری رکھا تو نجی سطح پر کوششیں بار آور نہ ہو سکیں گی۔

اندرونِ سندھ کے چھوٹے شہروں مثلاً دادو، لاڑکانہ سے بہت سے غیر سندھی ۱۹۷۲ء کے لسانی فسادات کے بعد ہی بڑے شہروں حیدر آباد اور کراچی میں منتقل ہو گئے تھے۔ حالیہ دورہ کے دوران میں نے محسوس کیا کہ پنجابی بولنے والے آباد کار سندھیوں میں اُبھرتی ہوئی پنجاب بیزاری سے تشویش میں مبتلا ہیں۔ میں نے ایک پُرانے پنجابی آباد کار سے جس کا خاندان ۱۹۰۱ء میں سندھ میں نقل مکانی کر گیا تھا، اِس بارے میں دریافت کیا تو اُس نے بتایا کہ شروع شروع میں عام سندھی جس گرمجوشی اور بھائی چارے کا ثبوت دیتا تھا وہ پاکستان بننے کے ایک دھائی کے بعد آہستہ آہستہ کمزور ہونا شروع ہوا۔ مگر ۱۹۷۰ء کے مارشل لاء کے بعد عام سندھیوں کی سوچ تیزی سے بدلتی چلی گئی۔

میں نے پنجابی آباد کاروں کے بارے میں کئی سندھی نوجوانوں سے بھی گفتگو کی۔ اُنہوں نے بتایا کہ پنجابی آباد کاروں کے خلاف اُن کی بڑی شکایت یہ ہے کہ وہ اب بھی پنجاب سے نئے آباد کاروں کو سندھ میں نقل مکانی کی ترغیب دے رہے ہیں۔ یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ عام سندھی دوسرے صوبوں سے آباد کاروں کی آمد کو قطعی ناپسند کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں اُنہیں یہ بات بالکل قابل قبول نہیں کہ پنجاب یا سرحد سے لوگ تلاش رزق میں یا مستقل سکونت اختیار کرنے کے لئے سندھ میں نقل مکانی جاری رکھیں۔ سندھ کے لوگ یہ خطرہ محسوس کرتے ہیں کہ اِس طرح سندھی بولنے والی آبادی اقلیت میں بدل جائے گی۔ علاوہ ازیں سندھ کی ملازمتوں اور معاشی وسائل پر سندھیوں کے استفادہ کے مواقع کم ہوتے چلیں گے۔ جہاں تک موخر الذکر معاملے کا تعلق ہے میں نے کئی مہاجروں کو سندھیوں کو ہمنوا پایا۔ کیونکہ وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ سندھ کی دولت اور ملازمتوں پر اُن کا اور سندھی بولنے والوں کا اولین حق ہے یوں کم از کم اِس معاملے میں مہاجروں اور سندھیوں کے مفادات میں اشتراک پایا جاتا ہے۔

سندھ میں عام لوگوں کی نقل مکانی کی وجہ یہ ہے کہ سندھ میں صنعت اور تجارت کی ترقی کا عمل نسبتاً تیز تر ہے۔ جو روزگار کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ ۸۱-۱۹۸۰ء کے اعداد و شمار کے مطابق صنعتی املاک میں سندھ میں بھی اتنا ہی سرمایہ لگا ہوا تھا جتنا پنجاب میں تھا۔ حالانکہ پنجاب کی آبادی سندھ کے مقابلے میں اڑھائی گنا زیادہ ہے پنجاب اور سندھ میں دس دس ارب روپے کی مالیت کے فکسڈ اثاثے تھے۔ صوبہ سرحد میں فکسڈ اثاثوں کی ملکیت تقریباً چھ گنا کم تھی۔ ظاہر ہے کہ ایسے حالات میں جبکہ کراچی میں روزگار کے زیادہ مواقع موجود ہوں اور سرحد اور پنجاب میں صنعتی سرمایہ کاری فی کس اعتبار سے کم ہو، تو سندھ کی جانب نقل مکانی کو روکنا بہت مشکل ہے۔ لیکن سندھ میں موجودہ احساسات کے پیش نظر بہتر یہی ہو گا کہ وہاں دوسرے صوبوں کے شہریوں کی مزید نقل مکانی نہ ہو۔ اِس مقصد کے لئے صوبہ سندھ کو کم از کم یہ اصول تسلیم کرنا ہو گا کہ صنعتی شعبے میں پنجاب اور سرحد میں زیادہ سرمایہ کاری کی جائے تاکہ صنعت اور تجارت کو فروغ حاصل ہو اور مقامی طور پر روزگار کے مواقع میسر آنے لگیں۔ ساتھ ہی ساتھ دیہی سندھ میں صنعتی ہنرمندی کی تربیت کے مزید ادارے قائم کرنے چاہئیں۔ تاکہ سندھ کی صنعتوں کے لئے مقامی آبادی سے ہنرمند لیبر مہیا ہونے لگے۔ اِس کے ساتھ یہ بھی بہتر ہو گا کہ دیہی سندھ میں نئی صنعتوں کی تنصیب کے اجازت نامے سندھی بولنے والے سرمایہ کاروں کو دیئے جائیں۔ جہاں تک سرکاری زمین کی فروخت یا آباد کاری کا تعلق ہے میری رائے میں سندھی آبادی اور بالخصوص سندھ کے محنت کش کاشت کاروں کا اُس پر حق

فائق ہے۔ فی الواقع منتخب جمہوری حکومت کا قیام اِس مسئلے کے حل کے لئے بڑا لازمی ہے۔ زراعت ایک صوبائی معاملہ ہے۔ زرعی اراضی کی الاٹمنٹ کا مسئلہ منتخب صوبائی حکومت کی صوابدید کے مطابق طے ہونا چاہیئے۔

مسائل کا حل۔ چند تجاویز

سندھ کے چند مسائل پر ہم بحث کر چکے ہیں۔ صوبے میں آباد متعدد لسانی آبادیوں کی غیر یکساں ترقی اور جمہوریت کے فقدان نے اِن مسائل کے اُلجھانے میں کردار ادا کیا ہے۔ ہم نے یہ بھی دیکھا کہ بہت سے مسائل جن کا منبع معاشی اور انتظامی بدانتظامی ہے۔ سندھ کے مخصوص حالات میں لسانی گروہوں میں باہمی اختلافات کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ہم نے یہ بھی عرض کیا ہے کہ سندھیوں کو اپنی زبان، کلچر اور اپنے سندھی تشخص سے بے حد اُنس ہے اور وہ اِن معاملات میں بہت حساس واقع ہوئے ہیں۔ اپنے عام رویے میں ایک عام سندھی اچھے اخلاق اور دھیمے مزاج کا مالک ہوتا ہے۔ تاہم وہ اب اپنے تہذیبی اور علاقائی تشخص کے معاملے میں مضطرب ہے اور کچھ عرصہ سے مشتعل بھی ہونے لگا ہے۔

پاکستان کے ہر صوبے میں کسی نہ کسی حد تک ایک سے زیادہ زبانیں بولنے والے افرادِ آباد ہیں مگر لسانی تفریق سوائے سندھ اور بلوچستان کے کہیں بھی گہری نہیں۔ لیکن اِس کا یہ مطلب نہیں کہ پٹھانوں کو پشتو عزیز نہیں ہے۔ اُنہیں بھی اپنی زبان سے ویسی ہی محبّت ہے جیسی سندھیوں اور بلوچوں کو اپنی اپنی زبانوں سے ہے۔ مگر جہاں سندھ میں اُردو بولنے والے حالیہ دور میں ہجرت کر کے آئے ہیں وہاں بلوچستان میں بلوچی اور پختون زبانیں بولنے والے عرصہ دراز سے اکٹھے رہتے آئے ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اب اُن کے باہمی اختلافات بڑھتے جا رہے ہیں۔ پنجاب میں انبالہ ڈویژن کے مہاجر جو سرگودھا اور جھنگ کے اضلاع اور ملتان شہر میں آباد ہوئے ایک ایسی پنجابی بولی بولتے ہیں جو سرائیکی سے مختلف ہے۔ تاہم روہتک اور حصار کے اضلاع ملتان کی طرح عرصہ دراز سے پنجاب کا حصّہ تھے۔ گویا پنجاب میں آنے والے مہاجرین عام طور پر پنجابی بولنے والے ہی تھے یا غیر منقسم پنجاب کی حدود ہی سے یہاں منتقل ہوئے تھے۔ صوبہ سرحد میں ہندکو اور سرائیکی بولنے والے افراد کافی تعداد میں موجود ہیں مگر وہ پختونوں کے لئے اجنبی نہیں اور نہ ہی وہ پشتو زبان سے ناآشنا ہیں۔ اِس کے برعکس سندھ کی پوزیشن مختلف ہے۔ پاکستان بنتے وقت سندھ تقریباً سو فیصد سندھی زبان بولنے والے افراد پر مشتمل تھا۔ لیکن اب وہاں تقریباً نصف آبادی ایسی ہے جس کا آبائی تعلق سندھی زبان سے نہیں۔ یہ ایک بہت بڑی تبدیلی تھی جو پچھلے ۳۷ سال میں واقع ہوئی اور یہ تبدیلی سندھی بولنے والوں کی توقع کے مطابق نہیں تھی۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ مہاجرین نے سندھ کی زبان اور ثقافت کے بارے میں کوئی مثبت رویہ اختیار نہیں کیا۔ یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ سندھی عوام نے برٹش انڈیا کی تقسیم کے بعد سندھ میں آنے والے مہاجرین کا

فراخدلی سے خیر مقدم کیا۔ لیکن بعد میں خوشگوار تعلقات کا یہ رشتہ کمزور ہوتا گیا اس کا ایک سبب اپنے کلچر اور زبان کے بارے میں مہاجرین کا بالادستی کا رویہ تھا۔ سندھ کی ثقافت اور مہاجرین کے نامناسب رویہ کے بارے میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی کتاب " پاکستانی کلچر " سے ایک اقتباس حسب حال ہے۔

" مہاجر آبادی تہذیبی سطح پر ایک احساس برتری کا جذبہ بھی اپنے اندر رکھتی تھی ۔ اور جذبات کی رو میں یہ بھول گئی تھی کہ احساس برتری کا یہ عمل نئے ماحول اور نئے ملک کی قدیم آبادی کے لئے ایک منفی عمل کا درجہ رکھتا ہے کوئی قدیم آبادی کسی باہر سے آنے والی آبادی کو خواہ وہ تہذیبی سطح پر کتنی ہی بلند کیوں نہ ہو احساس برتری کی سطح پر قبول نہیں کرسکتی ۔ رد عمل کے طور پر نفرت کے جذبہ نے اُس کی جگہ لے لی ۔ مہاجرین کا قصور یہ تھا کہ انہوں نے قدیم آبادی کے کلچر ، اُس کے مسائل کو سمجھنے کی کوششیں نہیں کی ۔ اور احساس برتری کے جذبے نے انہیں اندھا کر دیا کہ احترام کی سطح غائب ہو گئی ۔ اسی وجہ سے قدیم آبادی نے جلد ہی نئی آبادی کا استقبال کرنا بند کر دیا ۔ آنے والی آبادی یہ بھول گئی کہ ہجرت کے معنی تبدیلی کے ہوتے ہیں ۔ پھر یہ بھی کہ ہجرت کے ساتھ تہذیبی ادارے ہجرت نہیں کرتے ۔ اگر کرتے بھی ہیں تو شکستہ حالت میں ۔ اس لئے ان اداروں کو بھی نئے ماحول اور نئے تقاضوں کے تحت بدلنے کی ضرورت ہوتی ہے ۔ ہجرت کرنے والی آبادی اپنی چھوڑی ہوئی سوسائٹی کو دوبارہ قائم کرنے کا تصور تک نہیں کر سکتی ۔ " (پاکستانی کلچر صفحہ ۱۱۹)

غیر سندھیوں کی سندھی زبان کی علمی ، ادبی اور تاریخی اہمیت سے ناآشنائی بھی سندھ کے لسانی گروہوں کے درمیان کشیدگی کا باعث بنی ۔ سندھی زبان کا رسم الخط موجود ہونے کی وجہ سے اُس کی علمی ، ادبی اور صحافتی اہمیت ایک طویل عرصے سے موجود تھی ۔ جبکہ پنجابی ، بلوچی اور پشتو بولنے والوں کا معاملہ بالکل مختلف تھا ۔ اُن سب کی تحریری ، علمی اور ادبی زبان اُردو ہی تھی ۔ سندھیوں کا یہ مطالبہ کہ سندھی زبان کا وہ مقام جو انگریزی دور سے اُسے حاصل رہا ہے ، برقرار رہنا چاہیئے ، غیر ضروری طور پر تنازعہ کا باعث بنایا گیا ۔ اہل سندھ ملک کی سرکاری اور رابطے کی زبان کی حیثیت سے اُردو کے مخالف نہ تھے ۔ سندھیوں کا یہ مطالبہ بالکل جائز تھا کہ میٹرک تک سندھی زبان کی تعلیم لازمی ہو ۔

اوّلین مارشل لاء نے ہائی سکولوں میں سندھی زبان کو لازمی مضمون کی بجائے اختیاری مضمون قرار دے کر سندھ میں ثقافتی فروغ کے عمل کو بڑا صدمہ پہنچایا ۔ اگر یہ تبدیلی نہ کی جاتی تو شاید اب تک سندھ کی ساری نئی نسل تقریباً یکساں طور پر سندھی زبان بول رہی ہوتی ۔ ۱۹۷۲ء میں سندھی زبان کو صوبے کی سرکاری زبان قرار دیئے جانے پر اُردو بولنے والوں کی جانب سے احتجاج نے بھی قومی یکجہتی کو گزند پہنچائی ۔ اور پھر نواب مظفر حسین کے " مہاجر پنجابی پٹھان محاذ " نے بھی یکجہتی کے عمل میں رخنہ پیدا کیا ۔

سندھ میں اُردو ، پنجابی اور پشتو بولنے والی آبادی رہنمائی کے لئے مہاجر رہنماؤں کی جانب دیکھتی ہے ۔ کراچی کی مہاجر لیڈر شپ کا فرض ہے کہ وہ سندھ میں قومی یکجہتی کے فروغ کے لئے اندرون سندھ مہاجروں کے موثر سیاسی کارکنوں سے رابطہ پیدا کرے ۔ اور تمام گروہوں کو پُرامن طور پر اکٹھے رہنے کے لئے سوچ اور تدابیر اختیار کرنے پر آمادہ کرے ۔ کراچی کے چند نامور مہاجر زعماء نے سندھ یونٹی بورڈ اسی مقصد کے لئے قائم کیا تھا ۔ افسوس سے عرض کرنا پڑ رہا ہے کہ اِس بورڈ نے ابھی تک کوئی مؤثر کردار ادا نہیں کیا ۔ کیا ہی بہتر ہو کہ اِس تنظیم کی رہبری نسبتاً جوان اور فعال افراد کے سپُرد کی جائے ۔

سندھ میں مختلف لسانی گروہوں پر مشتمل ثقافتی انجمنیں قومی یکجہتی کے فروغ میں اہم کردار ادا کر سکتی ہیں ۔

تاہم محض ثقافتی رشتے سارے مسائل کا حل نہیں۔ آج کی صورت حال میں اولین شرط سچے جمہوری سیاسی عمل کی ہے جس میں تمام لسانی گروہ اپنی پسند کی سیاسی جماعتوں کے حوالے سے قومی معاملات میں شرکت کریں۔ قومی یکجہتی کے فروغ کی یہ بنیادی شرط ہے۔

سندھ کے معاشی وسائل پر روز افزوں اقتدار بھی اُن افراد کا قائم ہوتا گیا جن کی مادری زبان سندھی نہ تھی۔ پاکستان بننے کے بعد جو ترقی اور خوشحالی ہوئی وہ بیشتر دوسرے لسانی گروہوں کے حصّہ میں آئی۔ اور سندھی زبان بولنے والی آبادی مقابلتاً پسماندہ رہی۔ چنانچہ اِن حالات میں سندھ کے لئے آواز اٹھانے والوں کی بیشتر شکایات اور مطالبات بے جواز نہیں۔ ہم اس معاملے پر مزید بحث بعد میں کریں گے۔

ہم یہ بات دہرانے پر مجبور ہیں کہ اندرون سندھ بسنے والے پنجابی اور مہاجر اپنے مستقبل کے بارے میں تشویش میں مبتلا ہیں۔ جہاں تک مہاجرین کا تعلق ہے، وہ اپنے بچوں کی تعلیم اور ملازمتوں کے مستقبل کے بارے میں سندھی بولنے والوں اور پنجابیوں دونوں سے نالاں ہیں۔ اُردو اور سندھی بولنے والے دونوں گروہ پنجابیوں کی سندھ میں موجودگی اور پاکستان کی معیشت، سیاست اور انتظامیہ میں پنجابی بولنے والوں کی بالادستی پر سخت معترض ہیں۔ اکثر سندھی اور کئی مہاجر پٹھانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد اور یہاں سے دولت کما کر صوبے سے باہر ترسیل پر بھی اعتراض کرتے ہیں۔

بعض سیاسی عناصر نے پنجابی آباد کاروں کے بارے میں سندھی عوام کی ناپسندیدگی کو اپنا اثر ونفوذ بڑھانے کی بساط بنالیا ہے۔ تاہم سندھ میں ایک موثر طبقہ ایسا بھی موجود ہے جو محسوس کرتا ہے کہ ایسے پنجابی آباد کار جو مستقل طور پر سندھ میں آباد ہو چکے ہیں اور جو اتنی وافر دولت نہیں کماتے کہ صوبے سے باہر منتقل کر سکیں اُن پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیئے۔ بعض اعتدال پسند افراد یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ پنجابی آباد کاروں نے سندھ کی زرعی خوشحالی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ مگر موجودہ صورت حال کے پیش نظر پنجابی آباد کاروں کی سندھ میں پُرامن سکونت تبھی ممکن نظر آتی ہے جب وہ خود کو سندھی سمجھیں اور سندھ کے تہذیبی، معاشی اور سیاسی مفادات سے سانجھ کا رویہ اختیار کریں۔

گذشتہ چند سالوں میں سندھی بولنے والوں میں انتہا پسندی کا رجحان پیدا ہو چکا ہے اور ایک طبقہ اب اس نہج پر سوچنے لگا ہے کہ سندھ میں بسنے والے ایسے افراد مثلاً پٹھان اور پنجابی جن کا پاکستان کے کسی اور صوبے سے سابقہ تعلق رہا ہے وہ سندھ سے واپس نقل مکانی کر جائیں۔ اسی طرح یہ لوگ سندھ سے دوسرے صوبوں کو منتقل ہونے والی دولت کے بارے میں بھی اعتراضات کرتے ہیں۔ بینکوں کے ذریعے منتقل ہونے والی رقوم کے بارے میں مختلف اعداد وشمار پیش کئے جا رہے ہیں۔ ہم نے سندھ میں اُبھرتا ہوا یہ تاثر بھی پایا ہے کہ پاکستان کے مرکزی خزانے میں ٹیکسوں کی آمدن کا بہت بڑا حصّہ کراچی کی بندرگاہ یا سندھ میں نصب شدہ صنعتوں سے حاصل ہوتا ہے۔ اس نقطۂ نظر کے حامی افراد اس امر کی طرف اشارہ تک نہیں کرتے کہ سندھ میں پیدا ہونے والی دولت کے تمام مراکز مشترکہ قومی وسائل یا قومی قرضوں کے ذریعے قائم ہوئے ہیں۔ اور یہ کہ کراچی کی صنعتیں پاکستان کی پوری مارکیٹ کو ایک اکائی تصور کر کے قائم کی گئی ہیں۔

مجھے اندیشہ ہے کہ جب تک سندھ میں آباد متعدد زبانیں بولنے والے خیر سگالی کے جذبہ سے اپنے مسائل منتخب نمائندوں کے ذریعے گفت وشنید اور باہمی لین دین سے طے نہیں کریں گے، سندھ کے مسائل لاینحل ہوتے جائیں گے اور ایک ایسا وقت بھی آسکتا ہے جب سندھ میں خونی فسادات سے بچنا محال ہو جائے۔ اِس صورت حال کے

پیش نظر میرے خیال میں سندھ کے مسلمہ رہنماؤں کا جمہوری عمل سے اخراج انجام کار ملک کے لئے انتہائی خطرناک ثابت ہو گا۔ اور اُس کے نتیجے میں مختلف لسانی گروہوں کے باہمی مسائل و شکایات حل کرنے کی راہ میں سخت دشواریاں پیش آئیں گی۔

سندھ میں ۱۹۸۳ء کی تحریک سول نافرمانی کے دوران میں لسانی گروہوں نے باہمی فسادات سے احتراز برتا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ سمجھی جاتی ہے کہ سندھ میں مجموعی طور پر سندھی بولنے والوں اور دوسری زبانیں بولنے والوں کی آبادی تقریباً یکساں ہے اور ہر گروہ یہی سمجھتا ہے کہ بڑے پیمانے پر بدامنی کے نتیجے میں زندگی اجیرن ہو جائے گی۔ مگر یقیناً اس کی بڑی وجہ دیہی آبادی کے رہنماؤں کی اعتدال پسندی ہے۔ تاہم ہمیں یہ بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ آئندہ کسی بڑی تحریک کے جاری ہو جانے کی صورت میں یہ لازمی نہیں کہ نچلی سطحوں پر بڑے رہنماؤں کا موثر کنٹرول باقی رہے۔ ویسے بھی غیر ارادی طور پر کسی ایک حادثے کی وجہ سے عوام میں فسادات کی آگ بھڑک سکتی ہے۔ مناسب یہی ہو گا کہ شکایت اِس حد تک پہنچنے کی نوبت ہرگز نہ آنے پائے۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں اگست ۱۹۸۳ء کو جاری ہونے والی تحریک کے دوران شدید بدامنی پیدا ہوئی اور مظاہرین اور امن وامان بحال کرنے والے اہلکاروں کے مابین جھڑپیں ہوئیں۔ ایجی ٹیشن کے دوران میں سرکاری اعلان کے مطابق اکسٹھ افراد جاں بحق ہوئے۔ غیر سرکاری اندازے یہ تعداد کہیں زیادہ بتاتے ہیں۔ زخمیوں کی تعداد ہزاروں میں بیان کی جاتی ہے۔ اِس کے نتیجے میں سندھ کی سیاست میں انتہا پسند رجحانات تقویت پا گئے ہیں۔ فی الواقع پیپلز پارٹی کے بڑے رہنماؤں کے قریبی ساتھیوں نے برملا کہا ہے کہ سندھ کے بدلے ہوئے حالات میں اُن کے رہنما معمول کا رویہ قائم نہیں رکھ سکیں گے تاکہ وہ سیاسی اثر سے سبکدوش ہونے پر تیار نہ ہو جائیں۔ میں سردست اِس روز افزوں ملک بیزار رویے کا ذکر نہیں کر رہا جو کچھ طالب علم اور سیاسی کارکن اختیار کر رہے ہیں۔ تاہم اِس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ایجی ٹیشن کے بعد سندھی بولنے والوں کی شکایات اور دل آزاری میں بے شمار اضافہ ہوا ہے۔ اپنے پہلے مطالعاتی دورے کے دوران میں ہم نے دیہی سندھ کے خاص وعام کو شاکی پایا کہ پنجاب نے اُنہیں اکیلا چھوڑ دیا ہے۔ اِس بنا پر میری رائے ہے کہ اگر دیہی سندھ میں کوئی ایسی جماعت اہمیت اختیار کر گئی جس کی دوسرے صوبوں میں نمائندگی نہ ہوئی تو سندھ کی صوبائی سیاست کے تشویشناک رنگ اختیار کرنے کا خطرہ ہے۔ میری رائے میں پاکستان بھر کے عوام کو ایک دوسرے کے قریب لانے، ایک دوسرے کے نقطہ نظر کو سمجھنے اور اُن میں افہام وتفہیم پیدا کرنے کے لئے قومی پیمانے کی سیاسی جماعتوں کے وجود کی جتنی ضرورت اب ہے اِس سے قبل کبھی نہ تھی۔ غیر سیاسی بنیادوں پر منتخب افراد یا محلاتی گروہ عارضی استحکام تو پیدا کر سکتے ہیں مگر عوامی تائید سے محروم ہونے کی بنا پر قومی اتحاد کے فروغ کا باعث نہیں بن سکتے۔

صوبائی خود مختاری

ایم آر ڈی کی تحریک کے دوران سندھ کے موثر سیاسی رہنما قید یا نظر بند ہو گئے۔ اِس مدت میں سندھی عوام کی ترجمانی اور اُن کی رہنمائی کا کردار وہ افراد ادا کرتے رہے۔ جن کا تعلق سیاست کی بجائے فکر و ادب اور تعلیم سے رہا ہے۔ ہم

اپنے اولین دورے میں نومبر ۱۹۸۳ء میں اُن حضرات سے ملے ۔ خیال رہے کہ ان حضرات نے اِن دنوں اِس نوع کے بیانات دیئے کہ اب انہیں ۱۹۷۳ء کا آئین منظور نہیں۔ اور وہ مسلم لیگ کے ۱۹۴۰ء کے پاکستان ریزولیوشن کی بنیاد پر صوبائی اختیارات کا مسئلہ نئے سرے سے طے کرنا چاہتے تھے۔

دیہی سندھ سے تعلق رکھنے والے دانشور کچھ بنیادی نوعیت کے خدشات کا بھی اظہار کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ یہاں جمہوری حکومت کے قیام اور استحکام کے امکانات بہت تھوڑے ہیں۔ اِس لئے کہ قومیتوں اور پسماندہ علاقوں کے سیاسی اور تہذیبی مسائل حل کرنے کے لئے جس ساز گار فضا کی ضرورت ہے وہ معدوم ہوتی جارہی ہے۔ جمہوری سویلین حکومت کی عدم موجودگی میں فوج اور انتظامیہ نے جن میں پنجابیوں کی بھاری اکثریت ہے۔ پورے ملک کا کلی اختیار سنبھال رکھا ہے اور اِس طرح قومی معاملات میں دوسرے صوبوں کی شمولیت ختم ہوکر رہ گئی ہے۔ یوں سندھی رہنماؤں کا المیہ دوہرا ہے ایک یہ کہ پاکستان میں جمہوریت کے پنپنے کے امکانات محدود ہیں۔ دوسرا یہ کہ اُنہیں غیر جمہوری طرز حکومت قطعی ناپسند اور نامنظور ہے۔ اُن کے خیال میں اِس مشکل کا مداوا پنجاب کے پاس ہے۔ جب تک پنجاب کی رائے عامہ جمہور کش رجحانات کے خلاف منظم نہیں ہوتی۔ جمہوری حقوق کے لئے دوسرے صوبوں کی کوششیں بار آور ثابت نہیں ہوسکتیں اور ساتھ ہی وہ اِس خوف کا اظہار بھی کرتے ہیں کہ اگر پنجاب اور دوسرے صوبوں کی سوچ میں تضاد بڑھتا رہا تو قومی یکجہتی کی فضا مسموم ہوجائے گی۔ علاوہ ازیں وہ اِس مطالبے پر بھی غور کرنے لگے ہیں کہ وفاقی حکومت کے ڈھانچے کی ازسرنو تدوین کی جائے۔ تاکہ پارلیمان اور انتظامی ڈھانچے میں تمام صوبوں کی نفری یا شمولیت برابر برابر ہو۔ اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سندھ کے بعض رہنما فکری اعتبار سے قومیت پرست بلوچ رہنماؤں کے مؤقف کے قریب تر چلے گئے ہیں۔ جو قبل ازیں اِنہی خطوط پر سوچتے رہے ہیں۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے سندھ میں پیدا ہونے والے اکثر معاملات (مثلاً بڑے شہروں کی مقابلتاً خوشحالی یا سرکاری ملازمتوں کا مسئلہ) فطری طور پر لسانی رنگ اختیار کرلیتے ہیں۔ ایسی صورت میں آمریت مسائل کو مزید اُلجھا دیتی ہے۔ سندھ کے اُلجھے ہوئے مسائل کا حل جمہوری نظام کے استحکام میں مضمر ہے۔ یہی وہ نظام ہے جس سے اُمید کی جاسکتی ہے کہ صوبوں میں آباد مختلف لسانی گروہوں کے ہر دلعزیز رہنما باہمی رواداری کا ثبوت دیتے ہوئے آپس میں بیٹھ کر مسائل کا حل تلاش کرسکیں گے۔ سیاسی رہنما اب تسلیم کرتے ہیں کہ معیشت کی منصوبہ سازی اور انتظامی شعبوں میں بنیادی نوعیت کی تبدیلیوں کی بھی ضرورت ہے۔ ایک یہ کہ دیہی علاقے کو تیز رفتاری سے ترقی دی جائے اور زراعتی ترقی کے معاملے کو صوبائی اختیار میں دے دیا جائے، مرکزی حکومت کے مختلف ادارے جو امداد تعاون اور ریسرچ کے نام پر قائم ہیں اور فی الواقع صوبوں کی خود مختاری کو محدود کرنے کا اثر رکھتے ہیں۔ اُنہیں سرے سے توڑ دیا جائے۔ اِسی طرح صوبوں میں صنعتوں کی تنصیب کے معاملے کو مکمل طور پر صوبائی اختیار میں دے دیا جائے۔ اِس وقت مختلف ترقیاتی بنکوں، قرضے کی منظوری کے طریق کار اور مختلف حربوں سے یہ سب اختیارات وفاقی وزارت اور مرکزی اداروں کی تحویل میں ہیں۔ یہ صورت حال سراسر ناواجب ہے۔ صنعتی ترقی کا مسئلہ آئینی اعتبار سے صوبائی معاملہ ہے اور اُسے صوبوں کے اختیار ہی میں رہنا چاہیئے۔ فی الواقع صوبائی اختیارات کو موثر بنانے کے لئے لازمی ہے کہ مرکزی محکمے اور کنٹرول جو صنعت کے معاملے میں صوبائی اختیارات کو محدود کرتے ہیں، توڑ دیئے جائیں۔ صنعتی ترقی کی سرمایہ کاری کے بنک چاروں صوبے از خود قائم کریں۔ زراعت اور صنعت کی ترقی کے لئے وفاقی حکومت غیر ملکوں سے زرمبادلہ کے جو قرضے وصول کرے وہ صوبوں کے درمیان تقسیم کردیئے جائیں۔

امن وامان کا مسئلہ

ایم آر ڈی کی تحریک سول نافرمانی کے بعد اندرون سندھ میں ڈاکہ زنی کے واقعات میں یکایک اضافہ ہوگیا۔ اسی دوران یہ خبریں گردش کرنے لگیں کہ ڈاکوؤں کے بڑے بڑے گروہ ہیں۔ ایسی وارداتوں کی مختلف تاویلیں کی جانے لگی ہیں۔ ڈاکوؤں کا ایک اہم سرغنہ پرو چانڈیو مرنے کے بعد خبروں کا ایک اہم موضوع بن گیا۔ اخبارات کی اطلاع کے مطابق ہزار ہا عام دیہاتیوں نے اُس کی قبر پر عقیدت کے اظہار کے طور پر چادریں چڑھائیں۔ کچھ سندھی با اثر افراد اور دانشور بھی ڈاکوؤں کے بڑھتے ہوئے خطرے کا اقرار کرنے لگے۔ حکومت سندھ کے ایک سابق سیکرٹری نے بتایا کہ اب ڈاکو وڈیرے سے اپنی بات منوانے کی صلاحیت پیدا کر چکا ہے۔ جتوئی خاندان کے ایک ممتاز زمیندار نے خدشہ ظاہر کیا کہ ڈاکو اُن سے تاوان کا مطالبہ کرنے لگیں گے۔ گذشتہ سال ڈاکہ زنی کے مرتکب بعض افراد کے بارے میں یہ افواہیں گردش کرتی رہیں کہ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ کچھ لوگ سنجیدگی سے اندازہ لگاتے رہے کہ ڈاکہ زنی کے واقعات تخریب کاری کی مہم کا آغاز ہیں۔ اِن افواہوں کو سندھ کے باشعور طبقوں میں بڑی ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھا گیا۔ اُن کے خیال میں اِس قسم کی باتوں کی تشہیر اِس مقصد سے کی گئی کہ سندھ کے عوام پر انتظامیہ کی جکڑ بند کو مضبوط کرنے کے لئے رائے عامہ کو ہموار کیا جا سکے۔ جبکہ سندھی دانشوروں کے خیال میں ڈاکو بننے کی بڑی وجوہ دو ہیں۔ اوّل یہ کہ سندھ میں بیروزگاری پائی جاتی ہے اور دوسری یہ کہ کچھ ہاری وڈیروں اور پولیس کے ظلم سے تنگ آکر ردعمل کے طور پر قانون شکنی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ سندھ کے مشہور ڈاکو مثلاً پرو چانڈیو، نصیر فقیر، صاحب دینو ماچھی، کمال کھوسو، کھانو جاکھرانی وغیرہ اِسی زمرے میں آتے ہیں۔ سندھی دانشور ڈاکوؤں کے فروغ کی جو وجوہ بیان کرتے ہیں اُس کا حل یہ ہے کہ سندھ کی معیشت میں ایسی تبدیلی پیدا کی جائے کہ نوجوانوں کو روزگار میسر آئے اور ایسا معاشرتی اور انتظامی ڈھانچہ مبنی برانصاف قائم کیا جائے کہ وڈیرہ اور پولیس عام دیہاتی پر ظلم نہ کر سکیں۔ ڈاکوؤں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے میں نے سندھی بولنے والے ایک سابق اعلیٰ پولیس حاکم سے رابطہ قائم کیا۔ اُس آفیسر نے دو واقعات بیان کئے جس میں وہ خود ڈاکوؤں کے چھاپہ مار حملے میں گھر گئے تھے۔ اُن کے بقول ڈاکوؤں کے پاس جدید خودکار اسلحہ تھا اور اُن کے انداز سے کے مطابق ڈاکوؤں کو باقاعدہ جنگی مہارت حاصل تھی۔ اُنہوں نے یہ امکان ظاہر کیا کہ تربیت یافتہ گروہ کسی بیرونی اشارے پر صوبے کے نظم ونسق کی حالت کو برباد کرنا چاہتے تھے۔ اِس میں یہ سبق پوشیدہ ہے کہ اگر کسی وقت سندھ میں سیاسی بے چینی وسیع پیمانے پر پھیل جائے تو ایسے گروہ نظم ونسق کا گھمبیر مسئلہ پیدا کر سکتے ہیں۔ اور اگر یہ امکان بھی موجود ہو کہ ایسے گروہوں کو بیرونی تربیت یا امداد میسر ہو سکتی ہے تو اِس امر کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے کہ سندھ میں سیاسی اور معاشی اقدامات سے فضا ایسی پیدا ہونی چاہیئے جو تخریبی کاروائیوں کے لئے ناسازگار ثابت ہو۔

میری رائے میں سندھ میں اولین مسئلہ یہ ہے کہ وہی سندھ کی ترقیاتی منصوبہ بندی میں روزگار کی فراہمی کو اولین اہمیت دی جائے۔ یہی طریقہ منظم ڈاکہ زنی کے اسباب کا قلع قمع کرے گا۔ اگر اِس کے برعکس محض نظم ونسق کی کاروائیوں کے ذریعے اِس مسئلے سے نمٹنے پر اکتفا کیا گیا تو نہ صرف بنیادی سبب جوں کا توں موجود رہے گا

بلکہ بڑے پیمانے پر نظم ونسق کے اقدامات سے بے گناہ افراد کے نشانہ ستم بننے کا امکان پیدا ہو جائے گا جس کی کوکھ سے سیاسی بد امنی پیدا ہوگی جو ڈاکہ زنی کے فروغ کے لئے سازگار ماحول پیدا کرے گی۔

انتظامی اصلاحات

سندھ کے عام شہری اِن دنوں جو مسائل بیان کرتے ہیں۔ اُن کا تعلق عام طور پر انتظامی خرابیوں سے ہے۔ گویا عام شکایات کا منبع حکومت اور سرکاری کارپوریشنوں کا انتظامی ڈھانچہ ہے۔ انتظامی اہلکاروں کی اکثریت کا تعلق پنجاب سے ہے۔ جس میں سابق فوجی ملازمین کی تعداد روز افزوں ہے۔ اِس پس منظر میں پورا پنجاب مورد الزام قرار پا رہا ہے۔ حالانکہ عام پنجابی اِس انتظامی ڈھانچے سے خود بھی اتنا ہی شاکی اور دکھی ہے جتنا دوسرے صوبوں کے رہنے والے۔ یہ انتظامی ڈھانچہ اگرچہ خود بڑا طاقتور ہے مگر مُلک کو کمزور کر رہا ہے۔ یہ مسئلہ اہل پنجاب کے سوچنے کا ہے کہ وہ اِس ڈھانچے سے فیضیاب ہونے والے چند افراد کی خاطر کب تک بدنامی مول لیتے رہیں گے۔ میرے خیال میں اِس مسئلے کا حل یہ ہے کہ انتظامی ڈھانچے میں بنیادی ردو بدل کر کے زیادہ سے زیادہ اختیارات مرکز سے صوبوں کو اور صوبوں سے لوکل باڈیز کو منتقل کر دیئے جائیں۔

وہ تمام معاملات جو کمشنر اور ڈپٹی کمشنر کے فرائض میں شامل ہیں اُنہیں حتی الامکان لوکل باڈیز کے منتخب نمائندوں کے سپرد کر دیا جائے۔ سرکاری اہلکاروں کی موجودگی ذیلی ہونی چاہیئے۔ اِس کا خوش آئند اثر یہ ہوگا کہ سرکاری اہلکاروں کی استبدادی قوت کم ہو جائے گی اور جمہور کی طاقت میں اضافہ ہوگا۔ ہمارے ملک میں تعمیری فکر کے فقدان اور کرپشن کی وجہ سے سرکاری اہلکاروں کا جو رویہ بن چکا ہے وہ عوام میں حب الوطنی کے جذبات اُبھرنے کی راہ میں حائل ہو رہا ہے۔ سرکاری اہلکاروں کا رول کم ہونے سے حُب الوطنی کے جذبات اُبھرنے کی راہ میں رکاوٹ دور ہو جائے گی۔ علاوہ ازیں انتظامی ڈھانچے کو وفاقی نظام کے تقاضوں کے حوالے سے جلد بنچنے کی بھی ضرورت ہے۔ ۱۹۷۳ء کا آئین وفاق کے اصول پر تدوین کیا گیا مگر وفاقی نظام کا اظہار انتظامی ڈھانچوں میں کما حقہ نہیں ہوتا۔ وفاقی نظام کے اصولوں کے مطابق صوبوں کے انتظامی معاملات کی بجاآوری کی ذمہ داری سنٹرل سروس کی بجائے پراونشل سروس کے اہلکاروں کے سپرد ہونی چاہیئے انتظامی ڈھانچے کو اِس اصول کے مطابق بدلنے سے ہی صوبائی حکومتیں اپنے آئینی اختیارات کما حقہ، بروئے کار لا سکتی ہیں۔

مگر سب سے اہم ضرورت یہ ہے کہ مُلکی سیاست کو جمہوری انداز میں چلایا جائے۔ سیاسی جماعتوں کے مؤثر کردار کی راہ میں رکاوٹیں دور کی جائیں۔ ملکی سلامتی کا تقاضا ہے کہ قومی معاملات طے کرنے کے لئے سچے جمہوری اصولوں اور عوامی نمائندوں پر پورا انحصار کیا جائے۔ غیر معمولی حالات میں بھی فوج صرف وہی اور صرف اتنا کردار سرانجام دے جس کا منتخبہ حکومت آئین کے تحت اُس سے مطالبہ کرے۔ پاکستان کے تمام موثر اور حکمران گروہوں کو خصوصی طور پر اور پنجاب کے اہل الرائے کو عمومی طور پر یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ملکی سلامتی کی کلید چھوٹے صوبوں کے جمہوریت نواز اور متوازن سوچ کے حامل رہنماؤں کے ہاتھ میں ہے جو اپنے اپنے صوبے میں مؤثر اہمیت کے مالک ہیں۔ اُن کے خوشدلانہ تعاون

کے بغیر جمہوریت اور سیاسی استحکام ممکن نہیں۔ مزید یہ کہ بااثر رہنماؤں کو اپنا سیاسی کردار ادا کرنے سے محروم رکھ کر صوبے میں رہنے والے عام شہریوں سے حبّ الوطنی اور تعمیری کردار کا مطالبہ عبث ہے۔ البتہ ہمیں یہ تشویش ضرور لاحق ہے کہ جمہوریت کے استحکام کے لئے ایک مضبوط متوسط طبقہ سندھ کے دیہی علاقوں میں ناپید ہے۔ عام حالات میں سماجی ترقی کی رفتار تیز تر کرنے کے لئے بہتر ہوگا کہ صنعتوں کی تنصیب کے ساتھ ساتھ بنیادی نوعیت کی زرعی اصلاحات بھی نافذ کی جائیں۔ تاہم سندھ کے موجودہ حالات میں کسی ادھوری جمہوری حکومت یا غیر سندھی حکمرانوں کی جانب سے مؤخرالذکر اقدام مناسب نہ ہوگا۔ جو فقط اِس وقت موجود ہے اُس میں ایسا اقدام وڈیروں کے خلاف نہیں بلکہ سندھی یکجہتی کے خلاف متصور ہوگا۔ بنیادی نوعیت کی زرعی اصلاحات کا مسئلہ سندھ کے دو طبقات کا باہمی معاملہ ہے۔ وڈیرے بھی سندھی ہیں اور ہاری بھی۔ گویا یہ سندھ کا صوبائی معاملہ ہے۔ سندھ کے اندر ہاریوں کے مفادات کی حامی قوتیں موجود ہیں جو اس معاملے کو اندرون سندھ کسی نہ کسی طور طے کرلیں گی۔ سرِدست اوّلین اہمیت جمہوری نظام کی بحالی کو حاصل ہے

غیر سیاسی سوچ

دورہ سندھ کے دوران میں میرا کچھ ایسے غیر سندھی افراد سے بھی پالا پڑا جن کا خیال تھا کہ عوام کے مسائل وہ نہیں جو اُن کے رہنما بیان کرتے ہیں۔ اُن کے خیال میں اگر عوام کے مسائل حل کر دیئے جائیں۔ مثلاً کرپشن دور ہو جائے یا حکومت کی انتظامی حالت بہتر ہو جائے تو عام لوگ مطمئن ہو جائیں گے اور وہ رہنماؤں کے سیاسی مقاصد کے لئے آلۂ کار نہیں بنیں گے اِس نوع کی خوش فہمیوں میں مبتلا افراد وہ ہیں جو اِس بنیادی حقیقت سے ناواقف ہیں کہ مروجہ غیر منصفانہ معاشی نظام کی موجودگی میں معاشرے کی اصلاح یا کرپشن کے خاتمے کی سکیمیں غیر مؤثر ہوں گی۔ ملکی معیشت کو منصفانہ بنانے کے لئے حکمرانوں کے پاس کوئی واضح تصور موجود نہیں۔ اگر کوئی ایسا تصور ہوتا تو بھی مفاد پرست طبقات کی سماجی اور سیاسی برتری کی وجہ سے اُس پر عملدرآمد کے امکانات نظر نہیں آتے۔ اور پھر اگر ایسے امکانات پیدا بھی ہو جائیں تب بھی سیاست میں لسانی اور علاقائی مسائل کا عنصر مؤثر انداز میں شامل ہو جانے کے بعد علاقائی نقطہ نظر کے حامی رہنماؤں کا مقام ختم نہیں ہو سکتا۔ اِس سادہ لوح گروہ کا یہ بھی خیال ہے کہ غریب عوام کو سیاست کی کوئی فہم یا اُس میں دلچسپی نہیں ہوتی۔ بلکہ سیاست یا آئین کا مسئلہ بڑے سیاسی رہنماؤں کا پیدا کردہ ہے۔ اگر بقول اُن کے سیاسی رہنماؤں کے "ناپاک" وجود سے نجات حاصل ہو جائے تو سیاست کا "فساد" ختم ہو سکتا ہے۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ سیاسی اقتدار صرف بڑے لیڈروں کو ملتا ہے۔ اور عام شہری مسندِ اقتدار کو چھو نہیں سکتا۔ مگر ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ جب عوام کسی سیاسی لیڈر کی پیروی یا اُس کی تائید کرنے لگیں تو یہ امر کہ اُنہیں سیاسی سوجھ بوجھ ہے یا نہیں، نتیجے کے اعتبار سے غیر متعلقہ بات ہو جاتی ہے تاہم میں یہ بات تسلیم نہیں کر سکتا کہ پاکستان کے عوام سیاسی فہم و فراست سے نابلد ہیں۔ آج کے دور میں ایک آزاد ملک کا ہر فرد کسی نہ کسی حد تک سیاسی دلچسپی رکھتا ہے۔ فی الواقع ہمارے عوام کو سیاست سے اتنی زیادہ دلچسپی ہے، جتنی صدیوں پرانے جمہوری ممالک میں بھی موجود نہیں۔ رائے دہندگان کی جتنی بڑی تعداد پاکستان میں ووٹ ڈالتی ہے، اتنی امریکہ میں بھی نہیں ڈالتی۔ پاکستان کے موجودہ حالات میں جبکہ لسانی اور علاقائی تحریکیں اہمیت اختیار کر رہی ہیں۔ سیاسی لیڈروں کا

وجود ایک اعتبار سے باعثِ رحمت بھی ہے۔ بشرطیکہ لگاتار منصفانہ انتخابات ہوتے رہیں۔ منتخب نمائندوں کی موجودگی میں عام شہری کو جب مشکل پیش آتی ہے۔ تو وہ اُس کے بڑھے کے لئے مقامی رہنماؤں کے پاس جاتا ہے۔ اور یوں اسلام آباد شکایت کا ہدف بننے سے بچ جاتا ہے۔ اور پھر ہم یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ ہمارا ملک ایک وفاق ہے۔ کسی بھی وفاق کا استحکام جمہوریت کے بغیر ممکن نہیں۔ قراردادِ پاکستان اور اُس کے بعد پاکستان کے آئینی مسودوں، سابقہ اور نافذ شدہ آئینوں میں اِس اصول کو ہمیشہ تسلیم کیا گیا۔ کہ ہماری ریاست کا ڈھانچہ وفاقی ہوگا۔ اس وفاقی ڈھانچے کو تسلیم کر لینے کے بعد ہم جمہوری معمولات سے کیسے گریز حاصل کر سکتے ہیں؟ جمہوریت میں ہر علاقے اور ہر قومیت کو یہ جمہوری حق حاصل ہے کہ وہ آئین کے مطابق ملکی معاملات میں اپنا کردار ادا کریں۔

جمہوری حلقوں میں یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ ۱۹۷۳ء کے آئین میں دیئے گئے صوبائی اختیارات میں نہ صرف توسیع کی ضرورت ہے۔ بلکہ صوبائی خود مختاری کے تحفظ کے لئے بھی آئین میں ترمیمات درکار ہوں گی۔ آئین کی موجودہ مدوں کے تحت وفاقی حکومت اپنے آئینی اختیارات کے اندر رہ کر کسی ایسی صوبائی حکومت کو منہدم کر سکتی ہے۔ جو اُس کے سیاسی حریفوں پر مشتمل ہو۔ وفاقی حکومت کے متعلقہ آئینی اختیار پر قدغن عائد کرنے کی ضرورت ہے۔ اِس معاملے میں مناسب ہوگا کہ وفاقی حکومت کی جانب سے صوبائی وزارتوں کی برطرفی کو سینٹ کی پیشگی منظوری سے مشروط کر دیا جائے۔ مزید یہ کہ صوبائی گورنروں کے تقرر کے مسئلے کو بھی وفاقی حکومت کی کلی صوابدید پر نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ مناسب ہوگا کہ صوبائی گورنر مقرر کرنے سے پہلے وفاقی حکومت نامزد گورنر کے بارے میں سینٹ سے منظوری حاصل کرے۔ اِس طرح چاروں صوبوں کے نمائندے اِس عہدے کے لئے گورنر کی موزونیت کا اندازہ کر سکیں گے۔

علاوہ ازیں جمہوری حقوق کی نگہداشت کے لئے عدلیہ کی آزادی کے تحفظ کا انتظام بھی ہونا چاہیئے۔ بہتر ہوگا اگر اعلیٰ عدالتی تعیناتیوں کو سیاسی حکومت کے اثر سے نکالا جائے۔ چنانچہ ایک ایسے آزاد ادارے کے قیام کی ضرورت ہے جو ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے جج صاحبان اور چیف الیکشن کمشنر مقرر کر سکے۔ اخبارات کی آزادی اور ریڈیو ٹیلیویژن کی نشریات جمہوریت کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ اِن اداروں کی غیر جانبداری برقرار رکھنے کے لئے محکمہ اطلاعات اور ریڈیو اور ٹیلیویژن کے انتظامی معاملات اور حکمت سازی میں حزبِ مخالف کے لیڈر اور الیکشن کمشنر یا اُن کے نمائندوں کو بھی شامل کیا جائے۔ چنانچہ اِن مقاصد کے لئے آئین میں ضروری ترمیمات مناسب ہوں گی۔

بدقسمتی سے گذشتہ چند سالوں میں دائیں بازو کے کچھ ایسے لوگ بھی پیدا ہو گئے ہیں جو پاکستان کے وفاقی ڈھانچے اور جماعتی پارلیمانی کیرکٹر کو اپنے نظریاتی مقاصد سے متصادم تصور کرتے ہیں۔ اور نظریاتی نوعیت کا کوئی ایسا آئین رائج کرنا چاہتے ہیں جس سے اختیارات کی مرکزیت قائم ہو اور پارلیمان کو مذہبی علما یا شریعتی کورٹ کے تابع کر دیا جائے۔ شاید اُنہیں یہ معلوم نہیں کہ ہمارے ملکی استحکام کا انحصار اختیارات کی مرکزیت کو کم کرنے اور نمائندہ اداروں کو مستحکم کرنے پر ہے۔ میری استدعا ہے کہ وہ حقیقت کی دنیا میں واپس آجائیں۔ اور ٹھنڈے دل سے غور کریں کہ اپنے وطن کے سیاسی وجود کے درپے ہو کر آخر وہ کس نظریئے کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔

پنجاب کے دائیں بازو کے اہلِ قلم حلقوں سے ہم یہ درخواست بھی کرنا چاہتے ہیں کہ وہ صوبائی حقوق اور قومیتوں کے بارے میں نظریات کا اختلاف برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا کریں اور محض نظریاتی اختلاف کی بنیاد پر مخالف سیاسی عناصر کے لئے وطن دشمنی کے القابات عطا کرنے کا مشغلہ ترک کر دیں۔ اشتعال انگیز القابات حالات کو خراب تر کرنے

کا خوفناک نفسیاتی حربہ ہیں۔ اگر ہم تعصب سے بالاتر ہو کر سوچیں تو معلوم ہو گا کہ اس وقت اندرون ملک سوائے معمولی اقلیت کے جتنے بھی موثر سیاسی گروہ اور افراد موجود ہیں۔ وہ سب اپنے اپنے فکری انداز کے مطابق ملکی استحکام کے خواہش مند ہیں۔ ابتدائی مسئلہ محض جمہوریت کی بحالی اور وفاق اور صوبوں کے درمیان اختیارات کی تقسیم کا ہے۔ اگر جمہوریت بحال ہو جائے تو صوبائی اختیارات کا مسئلہ کوئی ایسا معاملہ نہیں جسے "کچھ لو اور کچھ دو" کے اصول اور جمہوری طریقہ سے حل نہ کیا جا سکے۔

حاصل بحث

۱۔ دیہی سندھ میں ۱۹۸۳ء کی سول نافرمانی کی تحریک اتنے بڑے پیمانے پر چلی ہے کہ اس نے سندھی رہنماؤں تک کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔ یہ تحریک ابتدا میں بحالی جمہوریت کی تحریک تھی۔ جس میں سندھیوں کی توقع کے مطابق اہل پنجاب نے بھرپور شرکت نہیں کی۔ پھر اس کے رد عمل کے طور پر اس تحریک نے سندھی قومیت کے حقوق کی تحریک کا رنگ اختیار کر لیا۔ وسیع پیمانے پر مظاہرے ہوئے چند علاقوں میں تشدد بھری کارروائیاں ہوئیں لیکن اس میں شک نہیں کہ تقریباً پوری سندھی بولنے والی آبادی اس تحریک سے نظریاتی ہمدردی اور جذباتی لگاؤ رکھتی تھی۔

قیام پاکستان کے بعد صوبہ سندھ کی لسانی اور تہذیبی ہیئت بدل گئی ہے۔ سندھ سے نقل مکانی کر کے جانے والے سندھی ہندوؤں کی جگہ بھارت اور پاکستان کے دوسرے صوبوں سے آنے والے افراد ملازمتوں اور معیشت کے جدید شعبوں پر متمکن ہو گئے ہیں۔ سندھ کے بیراجوں کی اراضی پر پنجاب سے بھاری تعداد میں آباد کار آ بسے ہیں۔ بہت سی زمین سرکاری ملازموں اور فوجیوں کو الاٹ کی گئی۔ سندھ کی صنعتی معیشت پر بھی دوسری زبانیں بولنے والے افراد کا قبضہ ہو گیا ہے۔ گویا معاشی وسائل اور ملازمتوں پر غیر سندھی قابض ہو گئے۔ اور سندھی بولنے والی آبادی دیہی علاقوں میں نسبتاً غربت زدہ اور پسماندہ رہ گئی۔ بعد میں پیپلز پارٹی برسر اقتدار آئی جس کا دیہی سندھ میں گہرا اثر تھا۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد اس کی جگہ فوجی حکومت قائم ہو گئی۔ اس طرح دیہی سندھ میں سیاسی محرومی کا احساس بھی پیدا ہو گیا۔ یہ سب حالات مل کر دیہی سندھ میں بہت بڑی ایجی ٹیشن کا باعث بنے۔ اس ایجی ٹیشن کے نتیجے میں سندھی بولنے والی آبادی میں مغائرت کا احساس شدت اختیار کر گیا۔

۲۔ حکومت نے تقریباً چار ماہ کی تگ و دو اور سخت گیر اقدامات کے بعد تحریک سول نافرمانی پر قابو پا لیا۔ حکومت بظاہر اس سے مطمئن نظر آتی ہے کہ سیاسی تشدد کے عملی مظاہرے کو قابو کر لیا گیا ہے۔ بار ہا یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ حالات کنٹرول میں ہیں۔ حالانکہ سندھی، پنجابی، اردو اور دوسری زبانیں بولنے والے باہم دگر شاکی ہیں۔ اور ان سب میں عدم تحفظ کا احساس پایا جاتا ہے۔ اگر ان سب کے لئے کوئی تسلی بخش حل نہ نکلا تو وسیع پیمانے پر فسادات کا امکان رد نہیں کیا جا سکتا۔ بھارتی حکومت کے تیور بتاتے رہتے ہیں کہ اگر بین الاقوامی صورت حال اجازت دے تو وہ پاکستان میں آئندہ کسی غیر معمولی بحرانی صورت میں مداخلت سے گریز نہیں کرے گی۔

۳۔ تحریک سول نافرمانی دب جانے کے بعد سندھی بولنے والی آبادی کا عمومی رویہ مایوسی اور نا امیدی کا رنگ

اختیار کر گیا ہے ۔ ایک عام سندھی کے خیال میں ازالے کی کوئی جمہوری صورت ممکن نہیں ۔ حتیٰ کہ تشدد بھری کاروائیاں بھی ریاست کی طاقت کے سامنے غیر مؤثر ثابت ہوئی ہیں ۔ میں اس رائے سے اتفاق نہیں کرتا کہ سندھی عوام میں نا امیدی کا رویہ مستقل طور پر قائم رہے گا ۔ میری رائے میں عوام کا رویہ بالآخر مندرجہ ذیل صورتوں میں ظاہر ہو گا ۔ (۱) سندھی بولنے والوں میں جارحانہ قومیت پرستی کے رجحان میں اضافہ اور پنجاب کے خلاف بیزاری ۔ (۲) صوبائی اختیارات میں اضافے کا مطالبہ (۳) نظریاتی اور سیاسی فلسفے کے خلاف ردعمل جو اسلام کے حوالے سے ذیلی قومیتوں کے وجود کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے ۔ (۴) پنجابی آباد کاروں کے خلاف تشدد کی کاروائیاں حتیٰ کہ سندھ میں آباد لسانی گروہوں کے مابین بدامنی کے واقعات ۔

۴ ۔ اسلام کے حوالے سے سیاسی اور نظریاتی تصورات جو پنجاب اور سندھ کے بڑے شہروں میں مقبول ہیں ۔ سندھ کے باشعور افراد کی بھاری اکثریت انہیں چھوٹی قومیتوں کے سیاسی حقوق اور معاشی مفادات کو پس پشت ڈالنے کا حربہ تصور کرتی ہے ۔ قوم میں اتحاد پیدا کرنے کے لئے لازمی ہے کہ پنجاب کے اہل الرائے مزید تاخیر کئے بغیر علاقائی مسائل اور قومیتوں کا نقطۂ نظر سمجھنے کی مخلصانہ کوششیں کریں ۔ اور اس طرح باہمی اعتماد کی فضا پیدا کریں ۔ بصورتِ دیگر قومی تشخص کے بارے میں موجودہ متصادم نظریات آگے چل کر گھمبیر شکل اختیار کر لیں گے ۔ ایک ایسے لمحے میں جب ملکی سرحدوں پر بھیانک خطرات منڈلا رہے ہیں ۔ سیاسی اختلافات حل کرنے کے لئے استبدادی حربے یا تشدد بھری کاروائیاں قومی وجود کو خطرات سے دوچار کرنے کا باعث ہو سکتی ہے ۔

۵ ۔ مارشل لاء اٹھنے کے بعد قومیتی رجحانات زیادہ شدت سے ظاہر ہوں گے ۔ جمہوری عمل میں جتنی تاخیر ہو گی یہ رجحانات اتنے ہی زیادہ شدید ہوں گے ۔ چنانچہ عوامی نمائندوں کے درمیان آئینی مسائل حل کرنے کے لئے مذاکرات کی ضرورت ہو گی ۔ ان مذاکرات کا بنیادی موضوع صوبائی اختیارات ہو گا ۔ وفاق کی روح کے مطابق صوبائی اختیارات کو مؤثر بنانے کے لئے آئینی تبدیلیوں کے علاوہ حکومت اور معیشت کے انتظامی ڈھانچوں میں بھی دور رس تبدیلیوں کی ضرورت ہو گی ۔

اندریں حالات پنجاب کو آئینی اور انتظامی ڈھانچے میں بنیادی تبدیلیوں کے لئے ابھی سے اپنا ذہن تیار کرنا چاہیئے ۔ آئندہ کے لئے پنجاب کے اخبارات ، شہریوں اور نمائندوں کے لئے واجب ہے کہ وہ صوبائی اختیارات کا احترام قائم رکھنے اور جمہوریت شکنی کے امکانات کا سدباب کرنے کے لئے اپنا بنیادی اور بھرپور کردار ادا کریں ۔

میری رائے میں آج کے حالات میں پنجاب کی حبّ الوطنی کے عملی اظہار کا یہی تقاضا ہے ۔

(یہ رپورٹ دسمبر ۱۹۸۳ء میں لکھی گئی اور دسمبر ۱۹۸۴ء میں اس پر نظر ثانی کی گئی)

دوسری رپورٹ

ابتدائی کلمات

دیہی سندھ میں امن و امان کی صورتِ حال ایک عرصے سے خراب چلی آ رہی ہے اور اصلاح کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ ڈاکے اور اغوا کے واقعات متواتر جاری ہیں۔ انتظامیہ ان کی روک تھام میں کامیاب نہیں ہو رہی۔ عام تاثر کے مطابق امن و امان کی اس خراب صورتِ حال میں پولیس کا عملہ خود کسی نہ کسی حد تک ملوث ہے۔ عوام اور بالخصوص مسافروں میں عدمِ تحفظ کا احساس پایا جاتا ہے۔ جہاں تک انتظامی خرابیوں اور رشوت ستانی کا تعلق ہے وہ پاکستان کے دوسرے علاقوں کی طرح دیہی سندھ میں بھی موجود ہیں۔ جن لوگوں نے فروری ۱۹۸۵ء کے انتخابات سے یہ سطحی توقع وابستہ کی تھی کہ اس کے نتیجے میں صورتِ حال میں اصلاح کا عمل شروع ہو گا۔ اُن کی امیدیں خاک میں مل چکی ہیں۔ روزنامہ نوائے وقت کے ایک وقائع نگار نے ۱۰ مئی ۱۹۸۶ء کی رپورٹ میں لکھا ہے کہ

"اغوا کی وارداتوں کا تسلسل بڑھ گیا ہے اور انتظامی مشینری بے دست و پا نظر آتی ہے۔ بدامنی کی لہر نے پیپلز پارٹی کی مقبولیت میں اضافہ کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ سندھ اسمبلی کے سابق سپیکر حسین ہارون اور اُن کے رفیق اسمبلی کے اراکین سندھ حکومت پر سنگین الزامات عائد کر رہے ہیں اور اُن کا کہنا ہے کہ صوبائی اہم شخصیات خود بدعنوانیوں میں شریک ہیں۔ صوبائی اسمبلی کے رکن سردار امتیاز پھلپھوٹہ کا کہنا ہے۔ کہ سندھ کی ایک اہم شخصیت کے صاحبزادے مجرمانہ سرگرمیوں تک میں ملوث ہیں۔"

سندھ کی تعلیمی صورتِ حال بالخصوص بڑی خراب ہے۔ جناب اقبال حیدر کی تحقیق کے مطابق کراچی یونیورسٹی کے امتحانات مقررہ شیڈول سے دو تین سال پیچھے ہیں۔ سندھ یونیورسٹی، لیاقت میڈیکل کالج جامشورو، چاند کا میڈیکل کالج اور ایگریکلچرل یونیورسٹی کے امتحانات شیڈول سے تین چار سال پیچھے ہیں۔ یونیورسٹیاں اور کالج فسادات کی وجہ سے لمبی مدت کے لیے بند کیے جاتے رہے ہیں۔ انٹرمیڈیٹ کالج اگر بند نہ ہوں تو سال میں عام طور پر صرف چار ماہ تعلیم دی جاتی ہے۔ امتحانات میں تاخیر کی وجہ سے مختلف سالوں میں داخل ہونے والے طلبا کی کلاسز کے متعدد سیکشن اکٹھے ہو گئے ہیں۔ جن کے لیے اساتذہ کی تعداد کم ہو گئی ہے۔ یونیورسٹیوں کے کیمپس میں بدامنی اور فسادات معمول کا رویہ بن گئے ہیں۔ اسی وجہ سے کراچی کے اعلیٰ تعلیم کے ادارے ۱۹۸۴ء میں پانچ ماہ اور ۱۹۸۵ء میں سات ماہ بند رہے۔ سندھ یونیورسٹی تقریباً تمام عرصہ بند رہی۔

کراچی میں صنعتی لیبر کا تقریباً اسی فیصد حصہ پنجابیوں اور پٹھانوں پر مشتمل ہے۔ کراچی کی ۲۲ ٹیکسٹائل ملیں بند ہو چکی ہیں۔ جس کے نتیجے میں ایک لاکھ لیبر بیکار ہوئی۔ سندھ میں بیروزگاری میں اضافہ دوسری علاقوں سے نقلِ مکانی کی وجہ سے جاری رہتا ہے۔

بنگلہ دیش اور افغانستان سے مہاجرین کی آمد جاری ہے۔ ایران، بھارت اور سنگاپور سے بھی کچھ لوگ آکر آباد ہو رہے ہیں۔ اس جاری نقلِ مکانی کی وجہ سے بیروزگاری اور جرائم میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ چنانچہ امن و امان کا مسئلہ حل ہوتا نظر نہیں آ رہا۔ انہی وجوہ کی بنا پر تعلیمی اداروں میں داخلے کا معاملہ بھی سنگین ہوتا جا رہا ہے۔

کراچی شہر کی امن و امان کی صورتِ حال خصوصی طور پر خراب ہو چکی ہے۔ منشیات، جوا اور سمگلنگ کا کاروبار

بڑے منظم پیمانے پر ترقی پا چکا ہے۔ جرائم پیشہ سرغنہ لوگ اپنی دولت اور اثر و رسوخ کے ذریعے سماجی طاقت حاصل کر رہے ہیں۔ انہوں نے بے روزگار اور نشے کے عادی نوجوانوں کو اپنے مقاصد کے لیے آلۂ کار بنا رکھا ہے۔ یہ برائیاں دنیا کے کئی بڑے شہروں میں پائی جاتی ہیں جہاں غربت زدہ آبادی اور بے روزگاری کے مسائل موجود ہیں لیکن کراچی کا مسئلہ اس اعتبار سے خراب تر ہے کہ یہاں فقہی اختلافات کی بنیاد پر مسلمانوں کے فرقہ پرست گروہ آپس میں فساد بپا کرتے رہتے ہیں۔ مزید یہ کہ غیر سندھی لسانی گروہ مثلاً پٹھان، بہاری اور مہاجر اکثر بڑے پیمانے پر فسادات میں ملوث رہتے ہیں۔

اکتوبر ۱۹۸۵ء میں سندھ یونیورسٹی جامشورو کے چند طلباء کے ساتھ ٹھوری کے ریلوے پھاٹک پر ایک انتہائی دکھ دینے والا واقعہ پیش آیا۔ جس کی مکمل عدالتی تحقیقات نہیں کرائی گئی۔ صرف کراچی ہائی کورٹ بار کی چار رکنی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ ہمارے سامنے آئی ہے۔ اس رپورٹ کے مطابق ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ داد و اور ڈی۔ آئی۔ جی حیدر آباد نے سرکاری موقف بیان کرتے ہوئے یہ کہا کہ پولیس کو مطلوب کچھ مجرمین دو بسوں میں انڈس ہائی وے پر سفر کر رہے تھے۔ چنانچہ پولیس نے ان بسوں کو ٹھوری کے ریلوے کراسنگ پر روکا۔ جس پر بسوں میں سے پولیس پر فائرنگ کی گئی۔ پولیس نے اپنے دفاع میں جوابی فائرنگ کی۔ جس میں تین طلباء سمیت پانچ افراد جاں بحق اور چار طلباء سمیت سات افراد زخمی ہوئے۔ ۸۸ افراد گرفتار ہوئے۔ جن میں ۵۱ طالب علم تھے۔ پریس نوٹ میں تین ملزمان کے نام بتائے گئے، جن پر قتل، ارادہ قتل، ڈاکہ زنی کے الزامات عائد تھے۔ اور یہ بھی بتایا گیا کہ دو بسوں سے تین کلاشنکوف رائفلیں، ۳۹۰ راؤنڈ اور ایک پستول برآمد ہوئے۔

ہائی کورٹ بار کی تحقیقاتی کمیٹی کے مطابق جن دو بسوں کو حیدر آباد سے چالیس میل دور ٹھوری کا ریلوے پھاٹک بند کر کے روکا گیا تھا۔ وہ سندھ یونیورسٹی کی ملکیتی بسیں تھیں۔ جن میں سوار تقریباً ایک سو طالب علم اور دوسرے افراد یونیورسٹی حکام کی اجازت کے بغیر چاند کا میڈیکل کالج میں منعقدہ سیمینار میں شامل ہونے کے لیے جا رہے تھے۔ ان بسوں کو بظاہر روکنے کی وجہ ستار موریو اور گل محمد جاکھرانی (ملزمین) کو گرفتار کرنا تھا۔ رپورٹ کے مطابق گولی سے دونوں ملزمین کو کوئی گزند نہیں پہنچا۔ موقع پر جاں بحق ہونے والوں میں چار طالب علم اور ایک چوکیدار تھا۔ بعد میں دو زخمی طالب علم زخموں کی تاب نہ لا کر وفات پا گئے۔ سات افراد زخمی ہوئے، جن میں چار طالب علم تھے۔ رپورٹ کے مطابق حکام نے بسوں سے گرفتار شدہ طلباء کے ساتھ بڑی بدسلوکی کی اور توہین آمیز رویہ اختیار کیا۔ اس واقعہ پر سندھ کے طول و عرض میں شدید غم و غصے کا اظہار کیا گیا۔

دیہی سندھ بلکہ پاکستان کے چاروں صوبوں میں دریائی پانی کی تقسیم کا مسئلہ نہ صرف شدید اختلافی صورت اختیار کر چکا ہے بلکہ سنگین سیاسی مضمرات کا حامل بھی ہے۔ دریائے سندھ پاکستان کی جغرافیائی وحدت اور مشترک مفادات کا ایک مظہر ہے مگر اس سے ہر صوبے کے اپنے اپنے مفادات وابستہ ہیں۔ افسوس ہے کہ سرکاری اور سیاسی رہنماؤں کی تنگ دامانی کی وجہ سے یہ دریا صوبوں کے باہمی اختلافات کا بڑا عنصر بن چکا ہے۔ اس مسئلے کو کوئی بھی حکومت جس میں جناب ذوالفقار علی بھٹو کی پاپولر حکومت اور جنرل ضیاء الحق کی بزعم خود مضبوط حکومت شامل ہیں، حل کرنے کی جرأت نہیں کر سکی۔ دریائی پانی کی تقسیم پر متعدد اعلیٰ عدالتی کمشن اور ماہرین کی کمیٹیاں اپنی رپورٹیں پیش کر چکی ہیں، جو کسی نہ

کسی صوبے کے نمائندوں کے لیے ناقابلِ قبول ہونے کے باعث شائع نہیں کی گئیں۔ ان رپورٹوں میں پانی کے وسائل کے کوائف اور مختلف علاقوں کی ضروریات کا جائزہ لیا جا چکا ہے۔ ہمارے خیال میں مسئلے کا حل کم از کم ایسے حکمران گروہ کے ذریعے تو ممکن دکھائی نہیں دیتا۔ جسے عوام جمہوری تسلیم نہ کرتے ہوں۔ تاہم جمہوری قاعدوں کے مطابق منتخب حکومت کے لیے بھی اس تنازعے کا ایسا حل دریافت کرنا آسان نہ ہوگا، جو سب صوبوں کے لیے یکساں طور پر قابلِ قبول ہو۔ البتہ ایسی منتخب حکومت کوئی نہ کوئی حل دریافت کرنے کی صلاحیت سے ضرور بہرہ ور ہوگی، جو صوبوں کے لیے مکمل طور پر غیر اطمینان بخش نہ ہو۔

دیہی سندھ معاشرتی ارتقاء کے جس درجے میں ہے، اس پس منظر میں سیاسی رہبری کا کردار ایک ہی سماجی طبقے یعنی بڑے زمینداروں کے حصے میں آتا ہے چنانچہ سیاسی جماعتوں کی تشکیل میں کلیدی کردار وہی ادا کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ بڑی بڑی جماعتوں کے رہنماؤں میں کسی نہ کسی حد تک یہ مقصد مشترکہ پایا جاتا ہے کہ وہ اپنی ملکیتی اراضی کا کس طرح اور کس حد تک بہتر تحفظ کر سکتے ہیں۔ اپنی فہم کے مطابق ہر بڑا سیاست دان زمیندار کسی نہ کسی سیاسی جماعت سے خود کو منسلک کر لیتا ہے۔ روایتی فکر کے زمیندار خود کو ریاستی طاقت کے دائیں جانب رکھتے ہیں۔ ایسے زمیندار مسلم لیگ میں شامل ہیں۔ اس کے برعکس ایسے بڑے زمیندار جنہیں یہ اندازہ ہو چکا ہے کہ بڑی بڑی غیر حاضر ملکیتیں مستقلاً قائم نہیں رہ سکیں گی اور صنعتی ترقی اور معاشرتی تبدیلی کے عوامی رجحانات آگے بڑھیں گے، انہوں نے خود کو پیپلز پارٹی سے منسلک کر رکھا ہے۔ وہ اپنے مفادات کا بہتر تحفظ فیڈرل پاکستان کے وجود میں دیکھتے ہیں۔ تاہم ایسے قومیت پرست لیڈر جنہیں اپنے لیے کُل پاکستان بنیادوں پر لیڈر شپ کے امکانات مایوس کن نظر آتے ہیں۔ انہوں نے پیپلز پارٹی کے پروگرام سے انحراف کر کے کنفیڈریشن کا نعرہ بلند کیا ہے۔ اس کے برعکس غیر جمہوری رجحانات کے حامل شیخ رجعت پسند مثلاً جی ایم سید علیحدگی پسند ہیں۔ ملک کے جمہوری مستقبل سے مایوس بہت سے قومیت پرست سیاسی کارکن اور بے روزگار سندھی نوجوان بھی اس زمرے میں شامل ہیں۔ تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ قومیت کا جذبہ اپنی ذات میں سیاسی قوت کا حامل ہو چکا ہے۔

جیسا کہ پہلی رپورٹ میں واضح کیا گیا تقریباً تمام افراد جن کی مادری زبان سندھی ہے اور چاہے وہ کسی بھی سیاسی گروہ سے متعلق ہوں، متعدد معاملات پر کم و بیش یکساں سوچ رکھتے ہیں۔ مثلاً یہ احساس عام پایا جاتا ہے کہ سندھ کی اراضی اور معیشت پر غیر سندھیوں کا قبضہ ہے۔ دوسرا مسئلہ جس پر سندھی قومیت تقریباً یک آواز ہے وہ تعلیمی اداروں میں داخلے اور سرکاری نوکریوں میں ملازمت کا مسئلہ ہے۔ شکایات کی تفصیل پہلی رپورٹ میں دی جا چکی ہے تاہم یہ تکرار اس بنیادی بات کا ذکر لازمی ہے کہ سندھی بولنے والے عوام و خواص اپنی تہذیب اور زبان سے شدت سے پیار کرتے ہیں، اور اس معاملے میں وہ اس نکتہ نظر سے اتفاق نہیں کرتے جو اسلام اور اردو زبان کے حوالے سے ان کی تہذیب اور زبان کی اہمیت کو کم کرنا چاہتا ہے۔ اس صورت حال کے بارے میں ڈاکٹر اسرار احمد امیر تنظیم اسلامی نے سندھ کے چھ روزہ دورہ کے بعد اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا "سندھ میں اسلام کا نام لینا بھی جان جوکھوں کا کام ہو گیا ہے" بحوالہ نوائے وقت مورخہ ۸ مئی ۱۹۸۶ء۔ میری رائے میں اس بات کو بالفاظ دیگر اس طرح پیش کیا جا سکتا ہے کہ چھوٹی قومیتوں کے حقوق کو تسلیم اور ان کے مسائل کو حل کیے بغیر اب پاکستان میں اسلام کو قومی اتحاد کا وسیلہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اگرچہ یہ بات اپنی جگہ

صحیح ہے کہ پاکستان کی ۹۵ فیصد آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے۔
اگرچہ سندھی بولنے والی آبادی میں نظریاتی اور سیاسی اختلافات کی بنا پر گروہ بندیاں موجود ہیں مگر ان لوگوں میں سوچ کے اعتبار سے مندرجہ ذیل امور پر بڑی حد تک اشتراک پایا جاتا ہے۔

۱ سندھی زبان بولنے والے تمام سیاسی اور نظریاتی گروہ یہ شکایت کرتے ہیں کہ دوسرے صوبوں سے آبادی کی نقل مکانی کے سبب وہ اپنے ہی صوبے میں اقلیت بن جائیں گے۔

۲ وہ اس بات کی توقع اور مطالبہ کرتے ہیں کہ پاکستان کی وسیع تر سماجی سیاسی اور تہذیبی زندگی میں انکے لیے ایک موزوں مقام متعین ہونا چاہیے۔

۳ وہ اکثریتی صوبے کی بالادستی کو پسند نہیں کرتے اور اس سے نجات پانے کے لیے سرائیکی صوبے کے قیام کے مسئلے پر دلچسپی سے غور کر رہے ہیں۔

۴ وہ اپنے سیاسی، تہذیبی اور معاشی مطالبات کو جذباتی تائید سے پیش کرتے ہیں۔

اندرون سندھ کے چھ مطالعاتی دوروں کے بعد میرا مجموعی تاثر یہ ہے کہ سندھی بولنے والے افراد عام طور پر پنجاب کے بارے میں طرح طرح کی شکایتوں اور بدگمانیوں کا اظہار کرتے ہیں۔ میرے مطالعے میں یہی بات سب سے اہم ہے کہ عام سندھی پنجاب یا پنجابی کے بارے میں ناپسندیدگی کے پیرائے میں تذکرہ کرتا ہے۔ یہی رویہ اب اُردو بولنے والوں میں بتدریج بڑھ رہا ہے۔ یہ ایک ایسی صورت حال ہے جس کو بیان کرنا انتہائی تکلیف دہ ہے مگر اس کو پوشیدہ رکھنا گھمبیر صورت حال سے اغماض کے مترادف ہے۔

سندھی زبان بولنے والی آبادی کے مسائل چار نوعیت کے ہیں۔ (اوّل) سماجی اور ثقافتی (دوم) معاشی (سوم) سیاسی اور (چہارم) نفسیاتی۔

فوری اہمیت کے اعتبار سے سب سے بڑا مسئلہ نفسیاتی ہے جو مذکورہ تینوں نوعیت کے مسائل کی طویل تاریخ سے پیدا ہوا ہے۔ نفسیاتی مسئلہ یہ ہے کہ عام سندھی کے خیال میں اُس کی حیثیت معاشی، سیاسی، ثقافتی غرضیکہ ہمہ جہتی طور پر زیردست اور محکومانہ ہو گئی ہے اُسے یہ صورت حال بدلنے کے بظاہر کوئی امکانات نظر نہیں آتے۔ اس لیے اُس میں مایوسی اور جھنجھلاہٹ پیدا ہو چکی ہے۔ نفسیاتی رویہ فوری توجہ اور دُور رس نتائج کا حامل ہوتا ہے۔ کیوں کہ حال میں اور مستقبل قریب میں اُٹھنے والا ہر قدم اُس رویے سے اثر پذیر ہوتا ہے۔ جذبات کی رو میں کوئی قدم ایسا بھی اُٹھ سکتا ہے۔ جو مستقل نوعیت کے ایسے اثرات مرتب کرے جو جذباتی کیفیت تبدیل ہونے کے بعد مضر یا غلط ثابت ہوں۔

ہمارے خیال میں نفسیاتی مسئلہ اولیں توجہ کا مستحق ہے۔ مگر اس مسئلے کا حل تہذیبی، معاشی اور سیاسی مسائل کے حل کے لیے سنجیدہ ابتدا کے بغیر ممکن نہیں۔ اگلے صفحات میں ان مسائل کے چند پہلوؤں پر غور کیا گیا ہے مسائل کے حل کے لیے اولیں شرط یہ ہے کہ پاکستان کے مؤثر حلقوں میں متعلقہ مسائل کا صحیح ادراک پایا جائے۔ میری رپورٹ اس سمت میں ایک کاوش ہے۔ تاہم قومی مسائل کا حل روادارانہ سیاسی عمل سے ہی ممکن ہے۔ فی الواقع آج ہماری قومی زندگی میں اوّلین اہمیت سیاسی شعبے کو حاصل ہے۔ جب کسی قوم میں معاشرتی خرابیاں، معاشی مسائل اور سیاسی بحران بیک وقت موجود ہوں تو اولیں اہمیت سیاسی بحران کو حل کرنے کی ہوتی ہے۔

بالخصوص جس قوم میں علاقائی یا قومیتی مسائل نمایاں تو ہو جائیں وہاں اِن معاملات کو خالص انتظامی اصولوں یا نیم جمہوری طریقوں کے ذریعے حل کرنا بحران کو گھمبیر بنا دیتا ہے۔ دنیا بھر کے تجربات نے ثابت کیا ہے کہ کسی کثیر اللسانی قوم میں جب اہم فیصلے غیر نمائندہ افراد کریں یا اہم مسائل غیر سیاسی یا نیم جمہوری انداز سے حل کرنے کی کوشش کی جائے تو ایسے اقدامات قومی یکجہتی کے فروغ میں مدد نہیں دیتے۔

اِن تعارفی کلمات کے ساتھ قارئین کی خدمت میں چار مقالات پیش کیے جاتے ہیں۔ اِن میں سندھ کی معاشی اور سیاسی صورت حال کے چند اہم پہلوؤں پر غور کیا گیا ہے۔ اور قومی مالیات اور آئینی معاملات پر اُبھرتی سوچ کا جائزہ لے کر جمہوری استحکام کے لیے ایک لائحہ عمل پیش کیا گیا ہے۔ یہ مقالات ٹکڑوں ٹکڑوں میں مختلف اوقات میں لکھے گئے۔ اِن کے موضوعات ملتے جلتے ہیں اِس لیے کئی ایک معاملات میں تکرار کا احساس ہوگا۔ میں نے اِس کی ایڈیٹنگ پر زیادہ وقت صرف نہیں کیا۔ میری پیشہ وارانہ مصروفیات اِس میں حائل رہیں اور پھر اشاعت میں مزید تاخیر میرے احباب کے لیے قابل برداشت نہ تھی۔

علاقائی پسماندگی اور قومی مالیات

قومی یکجہتی کے فروغ کے لئے پسماندہ علاقوں کو ترقی دینے کی فوری ضرورت ہے۔ یہ معاملہ ترقیاتی منصوبہ بندی اور مالی وسائل کے تعین میں اولین اہمیت رکھتا ہے۔ مگر اس مسئلے پر غور کرنے سے پہلے معاشی اعتبار سے مختلف علاقوں کی غیر یکساں ترقی کے اسباب پر مختصر بحث مناسب ہوگی۔

کسی علاقے کی ترقی کا انحصار بہت سے عناصر پر ہوتا ہے۔ اوّل یہ کہ وہاں سوشل سٹرکچر کیسا ہے۔ معاشی قوت اور سیاسی اقتدار کس طبقے کے ہاتھ میں ہے۔ عوام کا مادی زندگی اور دنیاوی معاملات کے بارے میں رویہ کیا ہے۔ خیال رہے کہ سماجی نظام جس قدر ظالمانہ اور استحصالی ہوگا پسماندہ طبقات میں محنت اور ترقی کا جذبہ اُتنا ہی مدہم پڑ جائے گا۔

دوم۔ معاشی وسائل کس نوع کے ہیں، اراضی کتنی زرخیز ہے۔ معدنی وسائل سے کتنا استفادہ کیا جا رہا ہے۔ اور یہ کہ معاشی وسائل کی تقسیم کس قدر منصفانہ ہے۔ یہ سب معاملات سماجی نظام اور فکری رجحانات کے تعین میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

سوم۔ اِس علاقے کی آبادی اور قوم کے معاشی وسائل کا باہمی تناسب کیا ہے۔ یہ اِس لئے کہ افرادی قوت کی کمی کے باعث قدرتی وسائل سے بھرپور استفادہ نہیں ہو سکتا۔ اِس کے برعکس پسماندہ معیشت پر آبادی کا زیادہ بوجھ غربت میں اضافے کا باعث ہوتا ہے۔

چہارم۔ یہ کہ افرادی قوت کی ترقی کے لئے صلاحیتیں کس قدر اجاگر ہو چکی ہیں۔ مثلاً تعلیم اور تکنیکی ترقی کا درجہ کیا ہے۔

پنجم۔ معیشت کا ذیلی ڈھانچہ مثلاً بندرگاہیں، سڑکیں، ٹیلیفون، ڈاک اور تار کا نظام، بنک، تعلیمی ادارے، ہسپتال وغیرہ کی سہولتیں کس قدر ترقی یافتہ ہیں۔

پنجاب کے وسطی اضلاع میں قیامِ پاکستان کے وقت سوائے بندرگاہ کے مذکورہ چوتھی اور پانچویں شرائط نسبتاً زیادہ پائی جاتی تھیں۔ یہاں۔ خیال رہے کہ سندھ اور دوسرے علاقوں میں "پنجاب" سے مراد وسطی پنجاب (یعنی لاہور، شیخوپورہ، قصور، گوجرانولہ، سیالکوٹ، گجرات اور فیصل آباد کے اضلاع) لی جاتی ہے۔ پنجاب کے سرائیکی بولنے والے اضلاع کے متعلق سندھ میں کوئی قابلِ ذکر شکایت نہیں پائی جاتی۔ اِسی طرح پنجاب کے شمالی اضلاع جنہیں پوٹھوار کا علاقہ بھی جاتا ہے۔ وہ بھی شکایتوں کے زمرے سے باہر ہے۔ وسطی پنجاب کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ علاقہ عرصہ دراز سے گنجان آباد رہا ہے۔ زراعت بڑھتی ہوئی آبادی کی متحمل نہیں ہو سکی۔ اِس علاقے میں بہت عرصہ پہلے فیوڈل سسٹم ختم ہو چکا تھا۔ اور اراضی کی ملکیتیں نسبتاً بہت چھوٹے پیمانے پر قائم ہو چکی تھیں۔ یہاں کے لوگ تلاشِ رزق میں چھوٹی چھوٹی صنعتوں کی جانب متوجہ ہوئے۔ یا پھر انہوں نے ملازمتیں اختیار کرنا شروع کر دیں۔ اِسی علاقے میں تعلیم، صنعتی ہنر اور متوسط طبقہ زیادہ پایا جاتا تھا۔ ذیلی ڈھانچے کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ۱۹۵۰ء میں جتنی سڑکیں پورے پاکستان میں تھیں اُن کا نصف حصّہ پنجاب میں واقع تھا۔ گویا وسطی پنجاب کے لوگ پاکستان کے نسبتاً ترقی یافتہ افراد تھے۔ اِس اعتبار سے دیکھا جائے تو

بھارتی پنجاب، یوپی اور بمبئی سے نقل مکانی کر کے آنے والے مسلمان مہاجر جو پنجاب اور سندھ میں آباد ہوئے اُن کا معتدبہ حصّہ بھی ترقی کی خصوصیات سے متصف تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مہاجروں اور وسطی پنجاب کے مقامی باشندوں نے سرکاری ملازمتوں، تجارت اور صنعت کے شعبوں کے لئے افرادی قوّت مہیا کی۔ جو شروع ہی میں حکومت اور معیشت کے انتظامی ڈھانچے پر مسلّط ہوگئی۔ آہستہ آہستہ صوبہ سرحد کے چند اضلاع بھی ترقی یافتہ ہو کر اِس گروہ میں شامل ہوگئے فطری طور پر ہر نو آزاد مُلک میں سیاست اور معیشت میں کلیدی کردار ایسے لسانی گروہوں کے افراد سرانجام دیتے ہیں جو نسبتاً ترقی یافتہ ہوں۔ اِس طرح اقتدار کا صرف چند ترقی یافتہ گروہوں اور قومیتوں کے افراد میں مجتمع ہو جانا ایک فطری عمل ہے۔ آزادی کے بعد جب ترقیاتی عمل جاری ہوتا ہے تو نسبتاً ترقی یافتہ قومیتیں اور علاقے تیز رفتاری سے ترقی شروع کر دیتے ہیں۔ اور اِس طرح مختلف علاقوں کی غیر یکساں معاشی حالت مزید ناہموار ہو جاتی ہے۔ یہ بات دوسری وجوہات کے ساتھ مل کر لسانی گروہوں کے مابین بدگمانیاں اور مشکلات پیدا کر دیتی ہے۔ ان مشکلات کو بیک وقت دو اقدامات سے حل کیا جا سکتا ہے۔ پہلا یہ کہ پسماندہ علاقوں اور گروہوں میں ترقی کی رفتار کو تیز تر کرنے کے لئے خصوصی اقدامات کئے جائیں۔ دوسرا یہ کہ پسماندہ لسانی گروہوں کو سیاسی اور انتظامی معاملات میں شریکِ کار بنایا جائے۔

جہاں تک پسماندہ علاقوں کی ترقی کی رفتار کو تیز تر کرنے کا تعلق ہے اِس میں کچھ معاملات ایسے ہوتے ہیں جن میں غیر انقلابی حکومت فوری طور پر کوئی اہم رول ادا نہیں کر سکتی۔ مثلاً سماجی سوچ اور اقدار کا بدلنا اور پسماندہ لوگوں کو استحصالی طبقات سے نجات دلانا، اِس کی خاص وجہ یہ ہے کہ چونکہ سیاسی اقتدار خود استحصالی طبقات کے پاس ہوتا ہے اِس لئے وہ موجودہ حالت کو بدلنے کے لئے ضروری اقدامات سے گریز کی پالیسی پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ تاہم کچھ معاملات ایسے ہیں جن پر عملدرآمد نسبتاً آسان ہے۔ مثلاً سڑکوں کی تعمیر، بجلی کی فراہمی، سکولوں کا قیام، سرکاری ملازمتوں کے لئے نئے اہلکاروں کا تقرر وغیرہ۔ وفاقی حکومت اِن معاملات پر کچھ عرصہ سے یقیناً توجہ دے رہی ہے۔

معاشی پسماندگی کو دور کرنے کے لئے جہاں مالی وسائل کی ضرورت ہے۔ وہاں کچھ مُہلت بھی درکار ہوتی ہے۔ مہلت کا مسئلہ بہت اہم ہے۔ جو ملک میسر وقت میں مدبرانہ اور منصفانہ اقدامات سے اپنے ہاں باہمی اعتماد اور قوم پرستی کا جذبہ پیدا کر لیتا ہے۔ وہ مضبوط اور مستحکم ہو جاتا ہے۔ عام خیال کے مطابق یہ مہلت صبر و استقامت سے حاصل ہو سکتی ہے۔ مگر صبر فی نفسہ کوئی مجرّد چیز نہیں۔ صبر سے کام لینے میں اُمید کی لو بھی درکار ہے۔ بالفاظِ دیگر اِس امر کا یقین کہ موجودہ حالت کو بہتر بنانے کے لئے موثر اقدامات کئے جا رہے ہیں۔ پھر ایک ایسے ملک کے لئے جس میں متعدد لسانی گروہ بستے ہوں، ایک نہایت اہم شرط جمہوری نظام کا قیام ہے۔ جس کے دائرہ کار میں ایسی قومیت جس سے صبر کی توقع کی جائے شریکِ اقتدار بھی ہو سکے۔ ہمارے ہاں پسماندہ لسانی گروہوں نے یقیناً صبر سے کام لیا ہے، اس کے باوجود کہ وہ طویل عرصے تک اقتدار میں عملی شرکت سے تقریباً محروم رہے ہیں۔

پاکستان میں جمہوری نظام کئی دوسرے پسماندہ ممالک کی طرح جہاں ایک سے زیادہ لسانی گروہ بستے ہیں سخت مشکلات سے دوچار ہوا۔ ایک بڑی مشکل یہ رہی کہ سیاسی اقتدار فوج کے پاس منتقل ہوا۔ فوج کا بیشتر حصہ پنجاب کے پوٹھوار علاقے اور باقی حصّہ ایک پختون علاقے سے تعلق رکھتا ہے۔ فوج جن سرکاری اہلکاروں کی مدد سے مُلکی انتظام چلاتی ہے۔ اُن کا تعلق بھی زیادہ تر پنجابی اور پشتو بولنے والوں سے ہے۔ چنانچہ سندھی اور بلوچی بولنے والی آبادی کو اقتدار میں عملی شرکت سے محرومی کا احساس ہوا۔ اِس طرح یہ دو لسانی گروہ فوجی اقتدار کی طوالت کے سبب قومی یکجہتی کے بارے میں زیادہ شدّت سے

مایوسی کا شکار ہوئے۔

ہماری رائے میں اوّلین اور فوری اہمیت ایک ایسے جمہوری نظام کے قیام کی ہے۔ جس میں تمام لسانی گروہوں کو بھرپور شرکت کا احساس ہو اور جو مل جُل کر علاقائی پسماندگی دور کرنے کے لئے بھرپور کوشش کر سکیں۔

اب ہم اُن خصوصی اقدامات کا ذکر کرتے ہیں جو ہمارے ہاں پسماندہ علاقوں کی ترقی کے لئے عمل میں لائے گئے۔ یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ ہمارے ہاں مالی وسائل لامحدود نہیں۔ ایک ایسے مُلک میں جہاں تکنیکی پسماندگی ہو، آبادی کا بوجھ زیادہ ہو، جذبہ تعمیر تقریباً مفقود ہو۔ قومی سیاست پر مفاد پرست طبقات کا قبضہ ہو اور کرپشن فراوان ہو، وہاں سرکاری شعبے میں مالی وسائل کی کمی ناگزیر ہے۔ اِس صورتِ حال میں جو وسائل میسر آئے یا غیر ممالک سے حاصل کئے گئے، وہ زیادہ تر بڑے بڑے منصوبوں مثلاً منگلا ڈیم، تربیلا ڈیم اور کراچی سٹیل ملز پر صرف ہوئے۔ سماجی شعبے میں مالی وسائل کی توجہ کے اوّلین مستحق صرف وہ علاقے تھے جہاں قومی یکجہتی کے لئے خطرہ محسوس کیا گیا۔ پاکستان کے ابتدائی دور میں یہ خطرہ مغربی پاکستان کے شمال مغربی علاقوں میں محسوس کیا گیا۔ چنانچہ صوبہ سرحد اور ملحقہ قبائلی علاقوں میں تعلیم، صحت، بجلی اور سڑکوں کی تعمیر پر خصوصی توجہ دی گئی۔ اِن علاقوں کو ٹیکس اور متعدد ملکی قوانین سے مستثنیٰ رکھا گیا۔ چنانچہ اِن علاقوں میں غیر ملکی اشیاء کی تجارت اور نشہ آور اشیاء کی پیداوار کو خوب فروغ ملا۔ اِن اقدامات سے ان علاقوں کو قومی معیشت سے وابستہ کرنے میں ضرور مدد ملی لیکن قومی کردار اور اقوامِ عالم میں ملکی وقار پر جو منفی اثرات مرتب ہوئے وہ ایک الگ موضوع ہے جو اِس وقت زیرِ بحث نہیں۔

پسماندہ علاقوں کی ترقی کے لئے حالیہ دور میں بھی خصوصی اقدامات کئے گئے ہیں۔ وفاقی بجٹ کے تحت بلوچستان اور مرکز کے زیرِ انتظام قبائلی علاقوں کی ترقی کے لئے خصوصی ترقیاتی پروگرام وضع کئے گئے۔ چنانچہ اِن علاقوں میں سڑکوں کی تعمیر اور بجلی اور پانی کی فراہمی کے لئے رقوم مختص کی گئیں۔ پچھلے کچھ سالوں میں سڑکوں کی تعمیر اور دیہی علاقوں میں بجلی کی فراہمی پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ جہاں تک سڑکوں اور بجلی کا تعلق ہے صوبہ سندھ نے پنجاب کے مقابلے میں زیادہ ترقی کی ہے۔ سڑکوں کی لمبائی جانچنے کے کئی ایک معیار ہیں۔ پہلا اہم معیار آبادی کے لحاظ سے اور دوسرا زیرِ کاشت رقبے کی مناسبت سے مانا گیا ہے۔ اِن دونوں معیاروں کے مطابق پنجاب دوسرے تینوں صوبوں کے مقابلے میں پیچھے رہ گیا ہے پہلے معیار کے مطابق ۱۹۵۰ء میں دس (۱۰) لاکھ افراد کے لئے پنجاب میں ۲۴۷ کلومیٹر سڑکیں تھیں۔ سندھ میں ۲۰۲ کلومیٹر، سرحد میں ۳۴۲ کلومیٹر اور بلوچستان میں ۱۹۵۸ کلومیٹر۔ ۱۹۷۹ء میں دس لاکھ افراد کی نسبت سے اِن صوبوں میں سڑکوں کی لمبائی علی الترتیب ۲۶۲، ۴۴۴، ۶۰۴ اور ۳۰۹۲ کلومیٹر ہو گئی۔

علاقائی پسماندگی کا مسئلہ اندرونِ پنجاب میں بھی پایا جاتا ہے۔ مگر وہ اب تک اِس لئے نمایاں نہیں ہوا کہ پسماندہ علاقوں کے سیاستدان اِس جانب متوجہ نہیں ہوئے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں، پنجاب کے کچھ علاقوں میں جو زبان مروج ہے وہ مرکزی پنجاب کی زبان سے مختلف ہے۔ سرکاری ملازمتوں میں اِن علاقوں کی شرکت بھی کم ہے۔ چنانچہ حالیہ اخباری اطلاعات کے مطابق سرائیکی بولنے والے چند رہنماؤں نے لسانی بنیاد پر شکایات کا سلسلہ شروع کر دیا ہے۔ ادیب اور متوسط طبقہ بھی دبے لفظوں میں احتجاج کرنے لگا ہے۔

لیکن اہم مسئلہ یہ ہے کہ مختلف علاقوں کے درمیان پائے جانے والے معاشی تفاوت کو دور کرنے کے لئے مالی وسائل کہاں سے آئیں۔ یہ وسائل دو سمتوں سے آ سکتے ہیں۔ اول ملکی پیداوار میں اضافے سے، جس کے لئے منصفانہ نظام اور جذبہ تعمیر بے حد ضروری ہے اور دوسرے اخراجات گھٹانے سے، جس کے لئے دفاعی اور غیر پیداواری اخراجات

کو کم کرنا ہوگا۔ دفاعی اخراجات کا بیشتر حصہ بھارتی خطرے کے مقابلے کے لئے مختص ہے۔ دراصل ہم یہاں ایک انتہائی مشکل صورتِ حال سے دوچار ہیں۔ بھارت کی افواج کا حجم پاکستان کی افواج کے مقابلے میں تقریباً تین گنا ہے۔ بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ۔ چنانچہ ہمیں اپنے تحفظ کے لئے دفاع کی جانب خصوصی توجہ دینی پڑتی ہے۔ پاکستان اور بھارت دونوں ممالک ایک دوسرے سے خطرہ محسوس کرتے ہیں جسے باہمی اعتماد دور کرسکتا ہے۔ مگر جب تک خطرہ موجود ہے، دفاع کا خرچ ہمارے مالی وسائل پر نسبتاً زیادہ بوجھ ثابت ہو رہا ہے۔ ۸۴-۱۹۸۳ء کے بجٹ کے مطابق ہماری ریونیو آمدن، کیپٹل وصولیوں اور خسارے کی سرمایہ کاری کی مجموعی رقم ۵۸۹۵ کروڑ روپے تھی۔ اس رقم میں بیرونی وسائل بھی شامل ہیں۔ (البتہ قرضوں کی واپسی کی رقوم بیرونی وصولیوں سے منہا کی گئی ہیں)۔ دفاعی شعبے میں اُٹھنے والے اخراجات، مذکورہ مجموعی رقم کا ۲۹٫۵ فیصد تھے جبکہ بھارت کے ۸۴-۱۹۸۳ء کے دفاعی اخراجات کی متبادل شرح صرف ۱۷ فیصد تھی۔ مگر بھارت کی ۱۷ فیصد رقم ۵۹۷۱ کروڑ روپے بنتی ہے۔ جبکہ پاکستان کی ۳۰ فیصد رقم ۳۵۱۷ کروڑ روپے ہے۔ پاکستانی سکے کی بیرونی قیمت بھی کم ہے۔ متعلقہ سکوں کی ڈالروں کی قیمت کے مطابق بھارت کے فوجی اخراجات پاکستان کے مقابلے میں تقریباً تین گنا ہیں۔ اس سے جہاں یہ نظر آتا ہے کہ سلامتی کے نقطہ نظر سے پاکستان کے دفاعی اخراجات ضروری ہیں وہاں یہ بات بھی پوشیدہ نہیں رہتی کہ دفاعی اخراجات کی زیادہ شرح ترقیاتی منصوبوں کے لئے ہمارے مالی وسائل کو محدود کر دیتی ہے اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ملک کے ترقیاتی اور فلاح و بہبود کے شعبے پس پشت جا پڑتے ہیں ۸۴-۱۹۸۳ء میں پاکستان نے اپنی مذکورہ مجموعی وصولیوں کا صرف ۳۶ فیصد ترقیاتی مدوں پر خرچ کیا۔ جبکہ بھارت میں اس مد پر خرچ ہونے والی رقم ۵۷٫۵ فیصد تھی۔ یہاں یہ بھی واضح رہے کہ ہمارے ملک میں ترقیاتی مد پر جو رقم خرچ ہوتی ہے۔ اُس کا بیشتر حصہ غیر ملکی وسائل سے دستیاب ہوتا ہے۔ چنانچہ ۸۳-۱۹۸۲ء میں جہاں پاکستان کے ترقیاتی بجٹ کا بیرونی وسائل پر انحصار ۵۳ فیصد تھا وہاں بھارت کا صرف ۱۰ فیصد تھا۔ اسی سبب ہماری معیشت پر قرضوں کا بوجھ بہت بڑھ چکا ہے۔ اب تک بیرونی قرضوں کی مالیت ہماری سالانہ قومی پیداوار کے ۳۲ فیصد کے برابر ہو چکی ہے۔ ۸۳-۱۹۸۲ء میں مصارف قرضہ کی رقم اس سال وصول ہونے والے بیرونی قرضوں کے ۸۵ فیصد کے برابر تھی۔

قومی یکجہتی دراصل ایک نفسیاتی کیفیت کا نام ہے۔ اب آپ خود سوچئے کہ جو قوم مالی وسائل کے لئے دوسروں کی اس قدر محتاج ہو، جتنے ہم ہیں اور جب ہمارے رہنماؤں کی بڑی تشویش متواتر یہی ہو کہ مالی ضرورت پوری کرنے کے لئے کسی بھی قیمت پر قرض حاصل کیا جائے، وہاں وہ نفسیاتی کیفیت کہاں سے آئے گی جس میں خود اعتمادی کو فروغ حاصل ہو سکے اور پھر جس قوم میں خود اعتمادی کا فقدان ہو وہاں قومی یکجہتی کا احساس کیوں کر اُبھرے گا۔ اس سارے مسئلے کا بنیادی سبب یہی ہے کہ ہمارے مالی وسائل کی نسبت سے دفاعی اخراجات بہت زیادہ ہیں۔ اس کے جواب میں جائز طور پر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ملکی سلامتی کے لئے کوئی بھی رقم زیادہ نہیں ہوتی۔ مگر شاید یہ بات ہماری نظر سے اوجھل ہے کہ دفاعی طاقت کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ ملکی معیشت از خود توانا اور دفاعی بوجھ برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو اور اگر معیشت اس قابل نہ ہو تو اتنے زیادہ اخراجات صرف غیر معمولی حالات میں ہی جائز تصور کئے جا سکتے ہیں۔ مگر ہمارے ہاں غیر معمولی حالات مستقل نوعیت اختیار کر چکے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ فوجی اخراجات کی بھاری شرح اندرونِ ملک تعمیری مقاصد کے لئے اتنے وسائل باقی نہیں چھوڑتی جو معاشی استحکام کے لئے درکار ہیں۔ ہمارے ہاں مسئلہ یہ بن گیا ہے کہ فوجی اخراجات کو قومی دفاع کے مترادف سمجھ لیا گیا ہے۔ جبکہ قومی دفاع کے لئے فوج کے علاوہ موزوں خارجہ پالیسی اور متعدد دوسرے لوازمات بھی اہم ہیں۔ مثلاً مضبوط معیشت، جذبہ حُب الوطنی، اندرونی استحکام، اور عام شہریوں کی فوجی تربیت۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں

اندرونی استحکام کے لئے اطمینان بخش سماجی اور سیاسی نظام، مضبوط صنعتی اور تکنیکی اساس اور طبقاتی طور پر آمدن کی منصفانہ تقسیم بے حد ضروری ہیں۔ یہ بات صحیح ہے کہ ہندوستان بھی سماجی شعبوں پر زیادہ خرچ نہیں کرتا اور وہاں بھی طبقاتی طور پر آمدن کی تقسیم غیر منصفانہ ہے مگر یہ مثال ہمارے لئے غیر متعلقہ ہے۔ اوّل اِس لئے کہ بھارت کے فوجی اخراجات کی شرح نسبتاً کم اور ترقیاتی اخراجات کی شرح زیادہ ہے۔ اور دوم اِس لئے کہ اِس کی صنعتی اور تکنیکی اساس مقابلتاً مضبوط ہے۔ چنانچہ وہ بڑی فوج اور فوجی اخراجات کا متحمل ہو سکتا ہے۔ اِس کے برعکس ہمیں اپنے دفاع کے لئے مختلف سٹریٹجی اور زیادہ وسیع نقطۂ نظر کا حامل نظام اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ جس سے دفاعی اخراجات کا بوجھ کم ہونے کے ساتھ ساتھ دفاعی استعداد بھی بڑھے۔ اِس سلسلے میں انتہائی اہم ذمہ داری سیاسی رہنماؤں پر عائد ہوتی ہے کہ وہ مناسب فضا پیدا کریں اور ایسی تدابیر اختیار کریں جن سے قوم میں یکجہتی کو فروغ ملے اور عوام میں قومی آزادی کے دفاع کا جذبہ اُبھر سکے۔ اگر یہ اقدامات بروقت نہ کئے گئے تو اندیشہ ہے کہ مشکلات میں گھری ہوئی معیشت پر بھاری فوجی اخراجات کے بوجھ سے قومی استحکام اور سلامتی پر منفی اثرات مرتب ہوں گے۔ شاید بھارت نے پاکستان کے حوالے سے جو دفاعی اور خارجہ پالیسی اختیار کر رکھی ہے۔ اُس کا مقصد بھی یہی ہے کہ پاکستان کی نسبتاً چھوٹی معیشت پر دفاعی اخراجات کا بوجھ بڑھا کر اُسے اتنا کمزور کر دیا جائے کہ اُسے بالآخر اپنے ہی ہاتھوں معاشی محاذ پر شکست ہو جائے۔

قومی یکجہتی کی بحث کے ضمن میں یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ پاکستان آئینی اعتبار سے ایک فیڈریشن ہے۔ ہمارے ہاں اگرچہ لسانی گروہوں کے مابین باہمی مفادات کا ٹکراؤ پیدا ہوا مگر اِس کے باوجود بڑی سیاسی پارٹیوں کے رہنماؤں کی طرف سے تمام مسائل کو فیڈرل ڈھانچے ہی میں طے کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ ہمارے خیال میں اگر جمہوری نظام قائم رہے تو پاکستان کے سیاسی رہنما اب بھی اِس پوزیشن میں ہیں کہ وہ قومی یکجہتی کے مسائل رواداری کے ذریعے وفاقی اور صوبائی اختیارات میں ردوبدل سے حل کر سکتے ہیں۔ یہاں ہم درکار آئینی تبدیلیوں پر بحث نہیں کریں گے کیونکہ ہمارا موضوع مالی وسائل تک محدود ہے۔ البتہ ہمیں یہ دیکھنا ہو گا کہ آئین کے مطابق مالی وسائل کے حوالے سے وفاق اور صوبوں کے درمیان کیا تعلق قائم ہے۔ عملاً کیا ہو رہا ہے اور قومی یکجہتی کے فروغ کے لئے اِس ضمن میں کیا کچھ ہونا چاہیئے۔

اِس معاملے میں پاکستان کی معیشت اور ٹیکسوں کا نظام سمجھنا ضروری ہے۔ سرسری جائزے سے ہی ظاہر ہو جاتا ہے کہ پاکستانی معیشت کا دارومدار زراعت اور بیرونی تجارت پر ہے۔ لیکن صحیح صورت حال یہ ہے کہ زراعت سے ریونیو کی وصولی بہت کم ہے۔ دوسری جانب برآمدات سے بھی کوئی قابل ذکر ریونیو حاصل نہیں ہوتا۔ ریونیو کا انحصار درآمدات اور بڑی صنعتوں پر ہے۔ پاکستان کی ٹیکس کی وصولیاں تین مدّوں سے آتی ہیں۔ اول درآمدات پر عائد شدہ امپورٹ ڈیوٹی اور سیلز ٹیکس سے، دوم انکم ٹیکس سے اور سوم صنعتی مصنوعات پر عائد ہونے والے ٹیکسوں مثلاً ایکسائز ڈیوٹی اور اور سیلز ٹیکس وغیرہ سے۔ جدید صنعتی اور بڑے تجارتی اداروں کا دو صوبوں کے چند مخصوص علاقوں میں محدود ہو کر رہ جانا اِسی جانب اشارہ کرتا ہے کہ اِن ٹیکسوں کی وصولی کا اختیار وفاقی حکومت کے پاس رہنا چاہیئے۔

ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ علاقائی اور قومیتوں کے مسائل کے باوجود پاکستان ایک معاشی وحدت ہے چنانچہ صنعتوں کی تنصیب میں یہی اُصول ہماری حکومت اور صنعت کاروں کے پیش نظر رہا ہے۔ کم از کم ابتداً معاشی ترقی کے اقدامات طے کرتے وقت علاقائی مفادات کو پیش نظر نہیں رکھا گیا۔ دوسرے متعدد ممالک کی طرح پاکستان میں بھی معاشی جدیدیت کی ابتداء بندرگاہ سے ہوئی۔ پاکستان کی واحد ترقی یافتہ بندرگاہ کراچی تھی۔ پہلے پہل بندرگاہ کے آس پاس درآمد

برآمد کی تجارت فروغ پذیر ہوئی بعد ازاں وہیں ایسی صنعتیں قائم ہوئیں جن کا خام مال درآمد ہوتا ہے۔ اور ایسی صنعتیں جن کی مصنوعات برآمد ہوتی ہیں اِس طرح کراچی پاکستان کا پہلا تجارتی اور صنعتی مرکز بن گیا۔

علم معیشت کا ایک اُصول ہے کہ قومی وسائل اِس طرح استعمال کئے جائیں کہ مجموعی معاشی پیداوار اور ترقی کی رفتار زیادہ سے زیادہ بڑھے لیکن اب چونکہ انتظامی صلاحیت ہنرمندی اور لیبر کے وسائل سب سے پہلے کراچی میں اکٹھے ہوئے اِسی بناء پر تیز رفتار ترقی وہیں ہوئی۔ ترقیاتی عمل کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ جو علاقہ صنعت کا پہلا مرکز بن جائے دوسری صنعتیں بھی وہیں قائم ہونے لگتی ہیں بالخصوص ایسی صنعتیں فروغ پانا شروع کرتی ہیں جو پہلے قائم شدہ کارخانوں کو ضروریات کی اشیاء فراہم کریں یا اُن کی مصنوعات خرید کر خود استعمال کریں۔ ایسی متعدد وجوہات کی بناء پر بہت سے اہم صنعتی اشیاء کی صوبہ سندھ کی فی کس پیداوار دوسرے صوبوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ سندھ کے دوسرے علاقوں میں کم از کم صنعتی شعبے میں ترقی نہیں ہوئی۔ مگر اِس بات سے انکار ممکن نہیں کہ کراچی کی صنعتوں کو فروغ پاکستان کی معاشی وحدت کی بناء پر ملا۔ اِسی طرح صوبہ سرحد کے معاشی مفادات مُلک کی مجموعی مارکیٹ سے وابستہ ہو چکے ہیں۔ باڑہ مارکیٹیں، ٹرکوں سے مال برداری کا کاروبار، تعمیراتی ٹھیکہ داری، شکر سازی کی صنعت، یہ سب کچھ پورے پاکستان کی مشترک مارکیٹ کی وجہ سے ممکن ہوا۔ اور اِس وجہ سے محنتی اور متحرک پٹھان تلاشِ رزق میں پاکستان کے طول و عرض میں پھیلے۔

پاکستان کی معاشی وحدت کے پیشِ نظر ٹیکس عائد کرنے کے موجودہ نظام میں کسی نمایاں تبدیلی کی گنجائش نظر نہیں آتی البتہ یہ ضروری ہے کہ وفاقی حکومت ٹیکس کی رقوم اکٹھا کرنے کے بعد اُنہیں اپنے خزانے میں ہی جمع نہ رکھے، بلکہ زیادہ تر رقم صوبائی خزانوں میں منتقل کر دے۔ یہ وفاقی طرزِ حکومت ہی کا تقاضا نہیں، بلکہ وفاقی حکومت اور صوبائی حکومتوں میں کشیدگی کے امکانات کم کرنے اور قومی یکجہتی کے رجحانات کی پرورش کے پیشِ نظر بھی لازمی ہے۔

۱۹۷۳ء کے آئین کے آرٹیکل ۱۶۰ کے مطابق ہر پانچ سال کی مدت کے دوران ایک نیشنل فنانس کمیشن مقرر ہوگا۔ جو وفاق اور صوبوں کے وزرائے خزانہ پر مشتمل ہوگا۔ اِس کمیشن کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ وہ ٹیکسوں کی نقد آمدن صوبوں اور وفاق کے درمیان تقسیم کرنے کا طریقہ کار وضع کرے۔ صوبوں میں منقسم ہونے والے ٹیکسوں میں کسٹم ڈیوٹی شامل نہیں۔ البتہ اِس میں انکم ٹیکس اور سیلز ٹیکس شامل ہیں۔ اگرچہ کپاس کی ایکسپورٹ ڈیوٹی بھی اس میں شامل ہے۔ مگر آج کل کپاس کی برآمد ڈیوٹی سے مستثنیٰ ہے۔ جہاں تک ایکسائز ڈیوٹی کا تعلق ہے۔ صرف اُن اشیاء پر عائد ڈیوٹی مذکورہ کمیشن کے احاطۂ اختیار میں آتی ہے جن کا صدر مملکت تعین کریں گے لیکن صدر مملکت نے کسی شے پر عائد ایکسائز ڈیوٹی فنانس کمیشن کے احاطۂ اختیار میں نہیں دی۔ چنانچہ عملاً انکم ٹیکس اور سیلز ٹیکس ہی ایسے دو ٹیکس ہیں جن کی نقد رقوم آرٹیکل ۱۶۰ کے تحت وفاق اور صوبوں کے درمیان منقسم ہوتی ہے۔ اِن دو ٹیکسوں کی رقوم وفاق کی کل ٹیکس کی وصولیوں کا صرف ۲۵ فیصد ہیں۔ وفاقی حکومت اِن دو مدات کی نقد وصولیوں کی ۸۰ فیصد رقم صوبوں کو تقسیم کر دیتی ہے۔ اور یہ تقسیم آبادی کی شرح کے مطابق ہوتی ہے۔

آرٹیکل ۱۶۰ کے حوالے سے مندرجہ ذیل باتیں قابلِ ذکر ہیں۔ اوّل یہ کہ ایکسائز ڈیوٹی کی کوئی رقم صوبوں میں تقسیم نہیں ہوتی۔ دوم یہ کہ مرکز کی طرف سے صوبوں کو دی جانے والی گرانٹ کے بارے میں اصول وضع کرنے کا اختیار بھی نیشنل فنانس کمیشن کے پاس ہے۔ سوم یہ کہ وفاقی اور صوبائی حکومتوں کی طرف سے سرکاری سطح پر قرضے حاصل کرنے کے متعلق اصول وضع کرنے کا اختیار بھی نیشنل فنانس کمیشن ہی کے پاس ہے۔ اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر آئین کے مطابق

جمہوری حکومت قائم ہو تو مالی وسائل کی تقسیم کے بارے میں حقیقی اختیار وفاقی کو نہیں بلکہ نیشنل فنانس کمیشن کو حاصل ہوگا۔ جہاں تک وفاق کا تعلق ہے اُس کا اختیار صرف اتنا ہے کہ وہ ٹیکس عائد اور وصول کرے۔ مگر جہاں تک بیشتر وسائل کی تقسیم کا تعلق ہے یہ کام صوبوں کی رضامندی سے طے کیا جائے گا۔ اِس سے ثابت ہوا کہ صوبے مرکز کے مالی وسائل کے لئے اتنے محتاج نہیں جتنا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔ مگر اِس کے لئے شرط یہ ہے کہ حکومت منتخب اور جمہوری ہو اور آرٹیکل ۱۶۰ بدستور موجود رہے اور اس پر صحیح معنوں میں عمل ہو۔

حکومت کا تجربہ رکھنے والے وزراء اور اعلیٰ اہلکاروں نے متعدد بار شکایت کی ہے کہ وفاقی حکومت اور اُس کے ملازمین مالی وسائل پر کنٹرول کی وجہ سے صوبائی حکومتوں کے اندرونی معاملات میں غیر ضروری دخل اندازی کا اختیار حاصل کر لیتے ہیں جس کے نتیجے میں صوبائی اختیارات جو آئین کی رو سے اُنہیں حاصل ہیں بے معنی ہو جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں اِس سے وفاقی حکومت اور صوبائی حکومتوں میں شکر رنجی پیدا ہوئی ہے۔ اِس شکایت کو دور کرنے کے لئے لازمی ہوگا کہ کوئی ایسا طریق کار وضع کیا جائے جس سے صوبائی حکومتیں مالی وسائل کے حوالے سے وفاقی حکومت کی بے جا دخل اندازی سے محفوظ ہو جائیں۔ اس سلسلے میں ایک تجویز یہ ہے کہ ایکسائز ڈیوٹی کی بیشتر رقوم بھی نیشنل فنانس کمیشن کے اختیار میں دے دی جائیں۔ دوسری تجویز یہ ہے کہ ایکسائز ڈیوٹی اور سیلز ٹیکس کی جمع شدہ رقوم وفاقی حکومت ہر ماہ نیشنل فنانس کمیشن کی تجویز کے مطابق صوبوں کو منتقل کر دے۔ تاکہ صوبوں کو مالی وسائل باقاعدہ ملتے رہیں اور وہ اِس قابل ہو جائیں کہ صوبائی ترقیاتی منصوبے اپنی ضرورت اور صوابدید کے مطابق تیار کر سکیں اور اپنے اختیار کے مطابق اُن پر عمل پیرا ہو سکیں۔

ہمارے خیال میں صوبوں کو اپنے آئینی اختیارات استعمال کرنے میں دو قسم کی انتظامی مشکلات پیش آتی ہیں۔ اول سنٹرل سپیریئر سروسز کا نظام اور دوم سرکاری کاروبار کو چلانے کے لئے مروج قواعد و ضوابط۔ اِس وقت انتظامیہ کا جو نظام رائج ہے اُس کے مطابق حکومت کے اہم عہدوں پر وفاقی حکومت کے ملازمین براجمان ہو جاتے ہیں۔ جو صوبائی وزراء اور صوبائی پالیسیوں کے نفاذ میں معاون ہونے کی بجائے تاخیر اور عدم تعاون کا رویہ اختیار کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ بالخصوص سرکاری کاروبار سرانجام دینے کے جو قواعد و ضوابط مروج ہیں۔ وہ صوبائی وزراء کو سرکاری افسران کے سامنے بے بس بنا دیتے ہیں چنانچہ ہمارے خیال میں ضرورت اِس امر کی ہے کہ اِن دونوں نظاموں میں تبدیلی پیدا کی جائے تاکہ سرکاری افسران اپنے بیوروکریٹک ہتھکنڈوں سے وفاقی اور صوبائی حکومتوں کے باہمی تعلقات کشیدہ کرنے کی طاقت سے محروم ہو جائیں۔

گذشتہ چند سالوں سے سندھ میں یہ سوچ اُبھر رہی ہے کہ کچھ ایسے ٹیکس جو اِس وقت وفاقی حکومت عائد اور وصول کرتی ہے اُنہیں صوبوں کے اختیار میں منتقل کر دینا چاہیئے۔ کچھ انتہا پسند افراد وفاقی حکومت کو سرے سے ٹیکس عائد کرنے کے اختیار سے محروم کرنے کا بھی مطالبہ کرتے ہیں۔ میرے مشاہدے کے مطابق سندھ کے کچھ حلقوں میں یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی ۱۹۴۰ء کی قرارداد نے وفاقی حکومت کو ٹیکس عائد کرنے کا سرے سے کوئی اختیار نہ دیا تھا یہ تاثر بے سروپا ہے۔ اِس قرارداد میں ریونیو کا بڑا ذریعہ کسٹم ڈیوٹی وفاقی حکومت کے اختیار میں دیا گیا تھا۔ خیال رہے کہ اُس وقت مسلم اکثریتی علاقوں میں بوجہ پسماندگی ٹیکس کی کوئی دوسری اہم مد موجود نہ تھی یہ وضاحت نظری بحث کے پیش نظر کی گئی۔ عملی زندگی کے فیصلے حقائق کے پیش نظر ہوتے ہیں۔ چنانچہ درپیش صورت حال میں مالی وسائل کے اہم معاملات طے کرنے کے لئے ۱۹۷۳ء کے آئین کے تحت وفاقی اور صوبائی حکومتوں کے مابین ایک تیسرا حکومتی ادارہ نیشنل فنانس کمیشن کے نام سے قائم کیا گیا جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے اگر یہ ادارہ فعال ہو کر کام کرتا تو شاید بہت سے مسائل پیدا نہ ہوتے۔

تاہم اب ایسے غیر سندھی حلقے بھی ہیں جو صوبائی اختیارات میں اضافے کے حامی ہیں اور ساتھ ہی دفاعی اخراجات کی بھاری شرح کم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ صوبوں کو ٹیکس عائد کرنے کے اختیارات تفویض کرنے کے بارے میں سنجیدہ غور و خوض کر رہے ہیں۔ اِس بارے میں ڈاکٹر بشیر حسن کے انڈی پنڈنٹ پلاننگ کمیشن نے "ہمارا تحفظ" کے نام سے مطبوعہ کتابچے میں واضح تجاویز پیش کی ہیں۔ ان تجاویز کے مطابق صوبوں کو ایکسائز ڈیوٹی، سیلز ٹیکس، کیپٹیل گین ٹیکس، تیل اور قدرتی گیس پر عائد کرنے کا اختیار ہونا چاہیئے۔ جبکہ وفاقی حکومت کسٹم ڈیوٹی اور انکم ٹیکس اور سپر ٹیکس عائد اور وصول کرے۔ البتہ ایسے کارخانے جو مرکزی حکومت کے شعبے میں واقع ہیں اُن سے وصول ہونے والی ایکسائز ڈیوٹی اور سیلز ٹیکس کی آمدن بھی وفاقی خزانے میں شامل ہونی چاہیئے۔ انڈی پنڈنٹ پلاننگ کمیشن نے معاشی وحدت کو قائم رکھنے کے مقصد سے یہ تجویز کیا ہے کہ ریلوے، بحری اور فضائی ذرائع سے سامان کی نقل و حرکت پر ٹرمینل ٹیکس بدستور وفاقی حکومت کے احاطۂ اختیار میں رہنا چاہیئے۔ تاہم ان تجاویز پر غور کرتے وقت صوبہ سرحد کے مفادات کو پیشِ نظر رکھنا پڑے گا جہاں سر دست صنعتی ڈھانچہ کمزور ہونے کی وجہ سے ایکسائز ڈیوٹی اور سیلز ٹیکس کی مد میں آمدن محدود ہے۔ چنانچہ ایسی کسی بھی تجویز کے لئے صوبہ سرحد کا اتفاق رائے درکار ہوگا۔ البتہ جہاں تک بلوچستان کا تعلق ہے اُس کے پاس تیزی سے ترقی پانے والے متعدد وسائل موجود ہیں جو اُس کے لئے وافر مالیات مہیا کر سکتے ہیں۔

قومی یکجہتی کو فروغ دینے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم صوبائی حکومتوں کو ملک کی ترقی اور تعمیر کے عمل میں تحرکت کا زیادہ سے زیادہ موقع دیں۔ اس وقت تک یہ رجحان رہا ہے کہ ترقیاتی پلان بنانے اور اُن پر عملدرآمد کی بیشتر ذمہ داریاں وفاقی حکومت نے اپنے پاس رکھی ہوئی ہیں۔ اکنامک سروے ۸۳-۱۹۸۲ء کے حصہ شماریات کے صفحہ ۲۱۳ کے مطابق وفاقی اور صوبائی حکومتوں کے سالانہ ترقیاتی پروگرام کی مجموعی رقم ۴۰ ارب روپے تھی۔ پلان کا ۹۲،۳ فیصد حصہ وفاقی حکومت نے اپنے اختیار میں رکھا اور بقایا ۷،۶ فیصد صوبائی حکومتوں کے سپرد کیا۔ منصوبہ کی تفصیل کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ بہت سے شعبے مثلاً زراعت اور صنعت جو آئینی اعتبار سے صوبائی اختیار میں آتے ہیں۔ اُن میں بھی کلیدی کردار وفاقی حکومت خود ادا کرنا پسند کرتی ہے۔ مثلاً ۸۳-۱۹۸۲ء میں صنعت کی مد میں تین ارب روپے خرچ ہوئے تھے جس کا ۹۷ فیصد حصہ وفاقی حکومت کے منصوبوں میں شامل تھا۔ ایسا کیوں ہے؟ اِس کی وجہ یہ ہے کہ سرکاری سرمایہ ایسے کارخانوں میں صرف ہو رہا ہے جنہیں مرکزی حکومت نے شروع کیا تھا یا پھر سرمایہ اُن صنعتوں میں جا رہا ہے جو صنعتوں کو قومیانے کے عمل کے بعد مرکزی حکومت کی قائم کردہ کارپوریشنوں کے احاطہ میں ہیں۔ بہتر ہوگا کہ آئندہ صنعتی شعبے میں مزید ترقی صوبائی حکومتوں کے ذمہ ڈالی جائے۔ جو صوبائی ترقیاتی کارپوریشنوں کے ذریعے اپنے پسماندہ علاقوں کی ترقی کے منصوبے بنائیں اور اُن کی تکمیل کریں۔ وفاقی کارپوریشنیں مزید سرمایہ کاری اپنے وسائل سے کریں۔ پسندیدہ طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنی صلاحیت کار بڑھائیں۔ ۸۳، ۱۹۸۲ء کے سالانہ ترقیاتی بجٹ سے معلوم ہوا کہ زرعی شعبے کے ترقیاتی اخراجات میں بھی ۳۶ فیصد اخراجات وفاقی حکومت کے لئے مختص تھے۔ حالانکہ وفاقی حکومت کو زرعی شعبے میں دخل اندازی نہیں کرنی چاہیئے۔ وفاق کا رول صوبوں کی زرعی پالیسیوں اور زرعی تحقیقات کو مربوط کرنے تک محدود ہونا چاہیئے۔ مگر عملاً یہ ہو رہا ہے کہ وفاقی حکومت نے اپنے ذمہ ایسے کام بھی لے رکھے ہیں جو صوبائی حکومتیں اپنے زرعی محکموں اور متعدد زرعی تحقیقاتی اداروں کے ذریعے سرانجام دے رہی ہیں۔ کچھ عرصہ قبل ایک وفاقی ادارے پاکستان زرعی ریسرچ کونسل نے ایک قومی زرعی ریسرچ سینٹر اسلام آباد میں قائم کیا ہے۔ اس سینٹر نے ۵۶۲ ہیکٹر اراضی پر ایک زرعی فارم بنایا ہے۔ اس

فارم میں تقریباً دو سیکٹر رقبے کے ۲۰ قطعات کی سطح ہموار کر کے اسے زیرِ زمین آبپاشی کا نظام مہیا کیا گیا۔ اِس فارم میں آبپاش زراعت کے تجربات کئے جائیں گے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ اسلام آباد اُن تمام علاقوں سے بہت مختلف ہے۔ جہاں آبپاشی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اسلام آباد میں نسبتاً زیادہ بارش ہوتی ہے۔ اور وہ حالات نہیں پائے جاتے جن میں مصنوعی آبپاشی کے تجربوں سے مناسب نتائج اخذ کئے جا سکیں۔ یہاں بارانی نوعیت کی زرعی ریسرچ ہو سکتی ہے۔ مگر اِس کی ضرورت بھی اس لئے نہیں کہ چکوال میں حکومت پنجاب نے پہلے ہی زرعی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم کر رکھا ہے۔ جہاں تک آبپاش زراعت کے مسائل کا تعلق ہے، اُن پر ایوب زرعی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور ٹنڈو جام اور ترناب کے زرعی تحقیقی اداروں میں ریسرچ ہو رہی ہے۔ اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرکزی حکومت مالی وسائل کو بے جا صرف کر رہی ہے اور ایسے شعبوں میں بھی دخل اندازی کر رہی ہے، جو اُس کی ابتدائی ذمہ داری نہیں۔ ضرورت اِس امر کی ہے کہ زرعی تحقیقات کے لئے مالی و سائل صوبوں کو منتقل کئے جائیں اور اُن کے تحقیقاتی اداروں کو بہتر اور اعلیٰ پائے کا بنایا جائے۔ یہ بالکل ضروری نہیں کہ صوبائی اداروں کے مقابلے میں، وفاقی حکومت تبادل ادارے بنا کر قومی وسائل کے ضیاع کا باعث بنے۔ وفاقی حکومت کو صرف ایسے مضمونوں پر اپنے وسائل صرف کرنے چاہئیں جو بین الصوبائی نوعیت کے ہوں۔ مثلاً فیول اور پاور۔

قومی وسائل کے تعین کا ایک اور پہلو بھی قابلِ توجہ ہے۔ وہ ہے جدید صنعتی شعبہ اور پسماندہ دیہی معیشت کا مسئلہ ہر صوبے کے متعدد اضلاع ایسے ہیں جہاں کسی نہ کسی وجہ سے جدید صنعتیں قائم نہیں ہوئیں۔ حکومت کی متعدد مراعات کے باوجود بڑی صنعتیں اِس جانب راغب نہیں ہوتیں۔ اگرچہ سڑکوں کی تعمیر اور بجلی کی فراہمی سے کاشتکاری کو جدید بنانے کی حوصلہ افزائی ہو رہی ہے۔ مگر متوسط اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے قیام کے بغیر بیروزگاری اور نیم بیروزگاری کا مسئلہ حل کرنے اور دیہی معیشت کو متوازن اور متنوع بنانا ممکن نہیں۔ اِس ضمن میں تجویز یہ ہے کہ چھوٹی صنعتوں کے فروغ کے لئے ٹیکس ہالیڈے کی ایک ترجیحی پالیسی اختیار کی جائے۔ مثلاً دیہی علاقوں میں گھریلو اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے فروغ کے لئے ٹیکس کی مراعات دی جائیں۔ اِس وقت پسماندہ علاقوں میں صنعتوں کی تنصیب پر ٹیکس ہالیڈے صرف اُن صنعتوں کو ملتا ہے جو کارپوریٹ سیکٹر میں واقع ہوں۔ ضرورت یہ ہے کہ دیہی پسماندگی دور کرنے کے لئے کارپوریٹ سیکٹر کی شرط ختم کی جائے۔

معاشی اعتبار سے دوسرے صوبوں کے متعدد دیہی علاقے، سندھ کے دیہی علاقوں سے زیادہ مختلف حالت میں نہیں۔ البتہ سندھ میں غیر مالک کاشتکاروں کی غربت کے ساتھ ساتھ لسانی امتیاز کا مسئلہ بھی شامل ہو گیا ہے۔ مارشل لاء کا طویل دور بوجوہ دیہی سندھ کی متعدد شکایات کو شدید تر بنا چکا ہے۔ چنانچہ سندھ میں قومی یکجہتی کے مسئلے کو وسیع تر معاشی اور سیاسی تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ دیہی سندھ میں تجارت اور چھوٹی صنعتوں کا حصّہ نسبتاً کم ہے۔ مگر اب معاملات اِس نوع کی شکایات کے ازالے تک محدود نہیں اور نہ ہی محض ترقیاتی اعداد و شمار سے محرومیوں کے بارے میں شکایات دُور کی جا سکتی ہیں۔ جب محرومی کی شکایات ایک بار شدّت اختیار کر لیں تو محض معیشت اور ملازمتوں کے شعبوں میں اصلاحات سے محرومی کے شکار لوگوں کو مطمئن نہیں کیا جا سکتا۔ کسی بھی نوع کی محرومیاں جب سیاسی زبان اختیار کر لیں تو بنیادی ضرورت اُن لوگوں کو سیاسی طور پر مطمئن کرنے کی ہوتی ہے اور سیاسی اطمینان اُس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک متوثر سیاسی رہنما غیر مطمئن رہیں۔

سندھ کے اُبھرتے فکری رجحانات

سیاست کے فکری شعبے میں سندھی ادیبوں، شاعروں اور اخبارات کے مدیروں نے اہم کردار ادا کیا ہے سندھ کے صوفیانہ ادب میں اپنی سرزمین اور کلچر سے محبت کا بھرپور اظہار پایا جاتا ہے۔ اِسی تسلسل میں ادیبوں نے سندھی وطنیت کے جذبہ کو نمایاں کرنے میں بڑا کردار ادا کیا ہے۔ اِس ضمن میں دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ اِن ادیبوں نے تصوف کے انسان دوست تصورات کو اجاگر کرکے معاشرتی برائیوں اور ظلم کے خلاف مؤثر آواز اٹھائی ہے۔ اور اس طرح معاشرتی انصاف کے رجحانات کی آبیاری کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ متعدد سندھی اصحاب ادب سیاسی کارکن مفکر اور تجزیہ نگار کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔

سندھی ادیب اور مفکر جو طبقاتی ناہمواریوں کے خلاف ہیں اور معاشی زندگی میں مساوات کے قیام کے مدعی ہیں اُن کے لئے سندھ کے صوفی شعراء کے کلام میں بہت سا مواد موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کلاسیکی ادب کو اپنے سیاسی اور معاشی پروگرام کی اشاعت کے لئے ایک مفید ذریعہ تصور کرتے ہیں۔ اِس کے برعکس سندھ میں آباد دوسرے لسانی گروہوں میں صوفیانہ تصورات کا کوئی قابل ذکر اثر موجود نہیں۔ البتہ اُن کے مذہبی حلقوں میں اسلامی قانون اور شریعت کے نفاذ کے لئے زیادہ دلکشی پائی جاتی ہے۔ یوں اُن کی سوچ سندھ کے ادیبوں کی سوچ سے بہت مختلف ہے۔ سندھ کے ایک ممتاز دانشور جناب ابراہیم جویو نے اِس خصوصیت کو نمایاں طور پر بیان کیا۔ اُنہوں نے کہا کہ سندھ کے عوام کو معاشرتی انصاف کے تقاضوں کو سمجھنے میں کم از کم کسی ایسے مذہبی بندھن کا سامنا نہیں جو پنجاب کے بعض حلقوں میں پایا جاتا ہے کیونکہ تصوف کے گہرے اثرات نے سندھ کے عوام میں فقہی تعصب کو بہت کمزور کر دیا ہے۔ اور وہ ذہنی طور پر مساوات اور اخوت کے نظریات کو قبول کرنے کی صلاحیت سے زیادہ متصف ہیں۔ سندھی مفکروں، ادیبوں اور شاعروں میں چند اہم نام یہ ہیں۔ مرحوم شیخ عبدالمجید سندھی، مرحوم مولانا عبدالغفور سیتائی، سید سردار علی شاہ، حیدر بخش جتوئی، قاضی فیض محمد ابراہیم جویو، شیخ مبارک ایاز، محمد عثمان ڈیپلائی، نیاز ہمایونی، تنویر عباسی، امداد حسینی، حمید سندھی۔

خیال رہے کہ یہی سندھ میں اِس وقت قومیت کی جو سوچ موجود ہے وہ سندھ کے منتخب نمائندوں نے پیدا نہیں کی۔ تاریخ گواہ ہے کہ اُنہوں نے عام طور پر حکمرانوں کا ساتھ دیا۔ حتیٰ کہ ون یونٹ کی قرارداد تک کی حمایت کی۔ لیکن بعد ازاں حالات کے دباؤ سے وہ مخالفت کرنے پر مجبور ہوگئے۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا سندھ میں سوچ اجاگر کرنے کا بنیادی کام ادیبوں، شاعروں اخبار نویسوں اور اساتذہ نے کیا ہے۔

سندھی بولنے والوں کی شکایات پرانی ہیں۔ اُن کی ابتداء کراچی کی سندھ سے علیحدگی اور سندھی زبان کی جگہ اُردو رائج کرنے سے ہوئی۔ بعد میں سندھی عوام کی مرضی کے خلاف ون یونٹ کے قیام کے دوران اُن میں اضافہ ہوا۔ پھر پنجابی آبادکاروں سرکاری حکام اور نوآبادیاتی اراضی کی الاٹمنٹ سے شکایات مزید بڑھیں۔ مارشل لاء کے نفاذ اور اُس کی طوالت کے باعث شکایات کی شدت میں اضافہ ہوا۔ سندھ کی شکایات کا ذکر پہلی رپورٹ میں ہو چکا ہے۔ یہاں صرف یہ بات کرنا مقصود ہے کہ عام سندھی اب سندھی قومیت کی شعوری منزل میں داخل ہو چکا ہے۔ اب یہ توقع کرنا کہ وہ کسی غیر جمہوری

یا زبردستی مسلط کئے ہوئے سیاسی نظام کو دل سے قبول کر لے گا محض خوش فہمی ہوگی۔ انتہا پسند سوچ کے پروان چڑھنے کی وجہ یہ ہے کہ سندھیوں کے نقطۂ نظر کو نہ تو وفاقی حکومت نے اور نہ ہی غیر سندھی نسانی گروہوں نے سمجھنے کی کوشش کی بلکہ پاکستان کے حکمران طبقے نے مقامی مفاد پرست طبقوں کو اپنے ساتھ ملا کر یہ سمجھ لیا کہ سندھ کا مسئلہ حل ہوگیا ہے۔ ادھر اس رویے کے ردعمل کے طور پر سندھ میں انتہا پسند رجحانات کی پرورش جاری رہی۔ متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے دانشور مثلاً ادیب، شاعر اخبار نویس اور اساتذہ فکری سطح پر صدائے احتجاج بلند کرتے رہے۔ جس سے سب سے زیادہ طالب علم متاثر ہوئے، بیروزگار نوجوانوں نے اس احساس میں شدت پیدا کر دی۔

انتہا پسند فکری گروہ

اندریں حالات سندھی قومیت پرستی کا جذبہ شدت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ قومیت پرستی کے کئی حامی پاکستان کو ایک قوم نہیں بلکہ چار قوموں پر مشتمل ایک ریاست تصور کرتے ہیں۔ اُن کی نظر میں سندھی بولنے والے ایک "قومیت" نہیں بلکہ ایک "قوم" ہیں۔ اس نقطۂ نظر کا حامل ایک گروہ بھارت سے آئے ہوئے مہاجروں کو بھی سندھی تصور کرتا ہے۔ مگر اس مطالبے کے ساتھ کہ وہ سندھی تہذیب اختیار کر لیں۔ ایک انتہا پسند گروہ اپنے مقاصد کے حصول کے لئے غیر آئینی اقدامات کو بھی جائز سمجھتا ہے۔ حتیٰ کہ کچھ لوگ مسلح جدوجہد کو بھی حق بجانب خیال کرتے ہیں۔

ہمارے خیال میں انتہا پسند قومیت پرست گروہوں کی تین قسمیں سامنے آتی ہیں۔ ان سب گروہوں میں یہ نظریہ مشترک ہے کہ پاکستان ایک قوم نہیں بلکہ ایک ریاست ہے جس میں چار قومیں بستی ہیں۔ پہلا گروہ کنفیڈریشن کا حامی ہے یہ نظریہ بتدریج اُبھر کر سامنے آیا ہے۔ اس گروہ کی قیادت ممتاز بھٹو کرتے ہیں۔ پڑھے لکھے افراد، نوجوانوں اور سیاسی کارکنوں میں اس نظریے کے لئے بڑی دلکشی پائی جاتی ہے۔ دیہی سندھ کے عوام میں اس نظریے کی مقبولیت کی راہ میں پیپلز پارٹی کی ہر دلعزیزی ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء کے دوران میں اور بالخصوص ایم آر ڈی کی تحریک سول نافرمانی کے بعد چند ایک نامور ماہرین تعلیم اور دانشوروں نے اس نظریئے کی بھرپور تائید شروع کی۔

دوسرا جی ایم سید کا گروہ ہے جسے "جئے سندھ" تحریک کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ گروہ سندھو دیش کے قیام کا دعویدار ہے۔ اب "جئے سندھ" تحریک کئی گروہوں میں تقسیم ہو چکی ہے۔ اُن میں سے ایک نامور گروہ کنفیڈریشن کے نظریئے کا حامی بن چکا ہے۔

تیسرا گروہ سوشلسٹ نظریات کا حامی ہے۔ سوشلسٹوں میں "عوامی تحریک" نسبتاً منظم اور زیادہ معروف ہے۔ اسے طالب علموں اور ایک حد تک چھوٹے کسانوں میں مقبولیت حاصل ہونے لگی ہے۔ یہ جماعت پہلے دو گروہوں سے اس اعتبار سے جُدا اہمیت کی حامل ہے کہ مذکورہ دونوں گروہ عملاً فیوڈل تسلط کے خلاف نہیں ہیں لیکن عوامی تحریک اس تسلط کو توڑنا چاہتی ہے۔ نوجوانوں میں سوشلسٹ نظریات کے لئے رغبت بڑھ رہی ہے "جئے سندھ" تحریک کا ایک گروہ بھی سوشلسٹ ہے۔

لندن میں قائم شدہ سندھ بلوچ پشتون فرنٹ نے چاروں صوبوں میں پیپر ٹی کی بنیاد پر پاکستان کی کنفیڈریشن کا

تصور پیش کیا ہے۔ جہاں تک پیریٹی کا تعلق ہے اُس کی حمایت میں ایک فکری لہر پہلے بھی موجود رہی ہے۔ جماعت اسلامی کے ایک کارکن نے مجھے بتایا کہ مولانا خیر محمد نظامانی نے بھی جو سندھ کے معمر صحافی اور مذہبی عالم ہیں اپنی نجی محفلوں میں موجودہ صورت حال میں پاکستان کا آئینی حل پیریٹی بتایا ہے۔ خیال رہے کہ مولانا نظامانی جنرل ضیاء الحق کی پہلی مجلس شوریٰ کے رکن رہ چکے ہیں۔ بقول شخصے اُنہوں نے ایک وفاقی وزیر سے اپنے ذاتی مراسم کی وجہ سے یہ رکنیت اختیار کی۔ مولانا خیر محمد نظامانی نے قیام پاکستان سے قبل ہی پیریٹی کا نظریہ پیش کر دیا تھا۔ آپ نے سندھی روزنامہ "باب الاسلام" کے ۸ جون ۱۹۴۷ء کے شمارے میں لکھا۔

> "اپنے بچاؤ اور حفاظت کی ضمانت لینا اور اپنی برابری کی حیثیت تسلیم کرانا کوئی گناہ نہیں۔ سب پاکستانی علاقے اسلامی ہیں۔ اِس لئے اُن کا فرض ہے کہ وہ آبادی کے اصول کے مطابق نمائندگی سے نیچے اُتر کر یکساں نمائندگی کے اصول کو تسلیم کریں۔ اور سندھ کو برابری کا درجہ دیں۔ آبادی بھی دوسرے صوبوں کی زیادہ ہو، ملٹری پر بھی اُن کا قبضہ ہو اور آئین ساز اسمبلی اور مرکزی حکومت میں بھی اُن کی اکثریت ہو تو پھر سندھ جیسا صوبہ ضرور تباہ ہوگا۔"

یہ فکری لہریں دائیں بازو کے معروف نفاذ شریعت کے نظریئے کے مدمقابل پیش کی گئی ہیں اور اِس وقت سندھی زبان بولنے والے متعدد سیاسی کارکنوں اور فعال نوجوانوں کی دلچسپی اور مطالعہ کا موضوع ہیں۔

سب سے پہلے ہم جناب جی ایم سیّد کے نظریئے کا ذکر کریں گے۔ جی ایم سیّد کے مطابق پاکستان میں عوام کو قومی دھارے میں مدغم کرنے کے مقصد سے مسلم قومیت کا نظریہ جس انداز سے پیش کیا گیا ہے اُس میں چھوٹی قومیتوں اور پسماندہ طبقات اور علاقوں کے مفادات اور حقوق کا تحفظ نہیں ہو سکتا۔ اور نہ ہی اِس صوبے میں دوسرے لسانی گروہوں کی بالادستی ختم ہو سکتی ہے۔ چونکہ اُنہیں پاکستان کے وجود کے اندر سندھ کے حقوق کا تحفظ نظر نہیں آتا اِس لئے اُنہوں نے سندھ کی پاکستان سے مکمل علیحدگی کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ اُن کے بقول سندھ پر حکمرانی اور اُس کے وسائل پر اصل حق سندھی زبان بولنے والوں کا ہے۔ معیشت میں اُن کا نظریہ سوشلسٹ طرز کا ہے۔ اِس سے اُن کی مراد یہ ہے کہ سندھ کے وسائل، تجارت اور صنعت پر حکومت کا قبضہ ہو۔ انفرادی ملکیت محدود ہو۔ حکومت سندھی بولنے والوں کی ہو۔ البتہ اُن کی سوشلزم پر کسی بیرونِ ملک سوشلسٹ تحریک کی چھاپ نظر نہیں آتی۔ بلکہ اُن کے سوشلزم کے تصور پر سندھی نیشنلزم کا گہرا اثر ہے۔ عملاً سوشلزم کا اُن کی سیاست میں کوئی اثر دکھائی نہیں دیتا۔ جی ایم سیّد سیاسی اور معاشی معاملات میں سیکولر سوچ کے قائل ہیں اور مذہب کا تعلق انسان کے ذاتی معاملہ تک محدود سمجھتے ہیں۔

جناب جی ایم سیّد نے سندھی نیشنلزم کا تصور اُبھارنے میں جو ابتدائی اور بنیادی کردار ادا کیا ہے اُس کے سبب وہ عام طور پر سندھی خواص و عوام میں بڑے احترام کا مقام حاصل کر چکے ہیں۔ تنظیمی شکل میں اُن کی تائید سندھی طلبا میں موجود ہے۔ اور غالباً اِس وقت طلبا میں اُن کا موید گروہ دوسری طلبا تنظیموں کے مقابلے میں زیادہ مؤثر ہے۔

ہمارے خیال میں جی ایم سیّد سیکولر مزاج کے سندھی نیشنلسٹ ہیں۔ سوشلزم سے اُن کا مقصد اُن پسماندہ معاشروں سے جُدا معلوم نہیں ہوتا جو یہ نعرہ اِس لئے لگاتے ہیں کہ قومی وسائل پر غیروں کا قبضہ ہوتا ہے جسے ختم کرنے کی ایک صورت سوشلزم ہے۔ اِس خیال کی تائید اِس امر سے بھی ہوتی ہے کہ جی ایم سیّد نے محنت کش طبقے میں کوئی تنظیمی کام نہیں کیا بلکہ بالادست طبقات میں اپنا اثر و نفوذ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

جناب جی ایم سید ہمیں بڑی فکری الجھنوں میں مبتلا نظر آئے۔ نومبر ۱۹۸۳ء میں جب میں اور پروفیسر فاروق حسنات اُن سے اُن کے گھر سن میں ملے۔ تو وہ ایم آر ڈی کی تحریک بحالی جمہوریت پر سخت معترض تھے۔ جمہوریت کی بحالی کی بجائے اُنہوں نے سندھ کی علیحدگی اور سندھو دیش کے قیام کا تصور پیش کیا۔ ہمیں یہ بھی محسوس ہوا کہ اُنہیں اپنے نظریئے کی راہ میں حائل سنگین مشکلات کا اندازہ ہے، جس کا حل اُنہوں نے بڑا ہولناک سوچ رکھا ہے۔ آپ نے کہا کہ سندھو دیش کے قیام کا طریقہ کار یہ ہوگا کہ جب تیسری جنگ عظیم واقع ہوگی یا علاقے میں کوئی ایسی جنگ ہوگی جس میں پاکستانی افواج تمام تر ملوث ہوجائیں۔ اُس وقت وہ سندھ کے بڑے شہروں میں جہاں غیر سندھی بولنے والے اکثریت میں ہیں۔ وہاں پانی، اشیائے خوردنی اور گیس کی سپلائی منقطع کردیں گے۔ اِس طرح دیہی سندھ کی شرائط پر سندھو دیش قائم ہوجائے گا۔ وہ اِس طرح سے واقع ہونے والی انسانی تکالیف کے مسائل سے بالکل غیر متاثر نظر آرہے تھے۔ تاہم جب ہم نے یہ دریافت کیا کہ کیا وہ پاکستان کے وجود کو برقرار رکھ کر سندھ کے مسائل کا کوئی حل ڈھونڈ سکتے ہیں تو اُن کا جوابی سوال تھا کہ وہ یہ معاملات کس شخص سے طے کریں۔ گویا حاصل گفتگو یہ ہوا کہ معاملات طے تو ہو سکتے ہیں مگر طے کرنے کے لئے جن نمائندہ افراد کی ضرورت ہے وہ ناپید ہیں۔ کچھ عرصہ بعد اُنہوں نے "نوائے وقت" کو ایک خصوصی انٹرویو دیا جو اس اخبار کے ۱۵ جون ۸۵ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ اس انٹرویو میں اُنہوں نے جمہوری نظام کو نہ صرف پنجاب کی بھاری اکثریت کی بالادستی کے مترادف قرار دیا بلکہ جمہوریت پسند قوتوں کو مفاد پرست بھی کہا۔ اُنہوں نے اِس موقع پر سندھ کے مسئلے کا حل جمہوری قوتوں کی بجائے فوج کے ساتھ طے کرنے کو ترجیح دی۔ انٹرویو کا متعلقہ حصہ درج ذیل ہے۔

"پنجاب میں اِس وقت دو گروہ ہیں۔ ایک فوج اور سول سروس اور دوسرا ڈیموکریٹک گروپ۔ میں فوج اور سول سروس سے زیادہ ڈیموکریٹک گروپ کو سندھ کے لئے نقصان دہ سمجھتا ہوں۔ پنجاب کا ڈیموکریٹک گروپ تاجروں، زمینداروں اور صنعتکاروں کی نمائندگی کرتا ہے۔ جمہوریت کے حامی اِس گروپ کا مقصد زمینیں حاصل کرنا، فیکٹریوں میں تجارت پر قبضہ اور سندھ کے عوام کو اقتصادی طور پر مفلوج بنانا ہے۔ یہ جمہوری طاقتیں ہر شے پر قابض رہنا چاہتی ہیں۔ بھٹو اِن کا نمائندہ تھا۔ اب مکا خان، اصغر خان، نور خان، فیض علی چشتی اِسی گروہ کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ اِن سب کا مقصد یہی ہے کہ جمہوریت آئے۔ ہمیں جمہوریت سے کوئی دلچسپی نہیں ہے کیونکہ جمہوریت پنجاب کی چھیاسٹھ فیصد اکثریت کا نام ہے۔ ہم ایسی جمہوریت کو سندھ کے لئے زہر سمجھتے ہیں۔

سوال:۔ پھر فوج اور سول سروس کے بارے میں آپ کا کیا نکتہ نظر ہے۔

جواب:۔ فوج اور سول سروس کی موجودگی میں آئینی ترامیم میں مفاہمت ہو سکتی ہے۔ لیکن چونسٹھ فیصد اراکین سے ہمیں سمجھوتے کی کوئی اُمید نہیں ہے۔

سوال:۔ اگر بالفرض آئینی ترامیم ہوجائیں تو آپ پاکستان کے وجود کو تسلیم کرلیں گے۔ اور سندھو دیش کے نعرے سے دستبردار ہوجائیں گے۔

جواب:۔ اس کا انحصار حالات پر ہے۔ مفروضوں پر بات نہیں ہو سکتی۔ مستقل مفادات کی حامل طاقتیں بھی سرگرم عمل ہیں۔ پنجاب کے جمہوریت کا حامی گروپ ایسی سوچ کا نمائندہ ہے۔ یہ استحصالی قوتوں کا مظہر ہے۔

سوال:۔ اور فوج اور سول سروس؟

جواب:۔ فوج استحصالی قوتوں کی نمائندگی نہیں کرتی۔ اُن میں سے چند لوگوں کو زمینیں ملی ہیں۔ لیکن بحیثیت مجموعی اُن کا مفاد صرف تحفظ

ملک ، دفاع اور ملازمت سے ہے ۔ فوج کے لوگ سمجھدار اور پڑھے لکھے ہیں ۔ میرا نظریہ ہے کہ جب تک چھوٹے صوبوں سے سمجھوتہ نہ ہو جائے پاکستان قائم نہیں رہ سکتا ۔ فوج سے اُمیدیں ہو سکتی ہیں کہ وہ پاکستان کو بچانے کے لئے چھوٹے صوبوں سے سمجھوتہ کرے اور بھارت سے افہام وتفہیم کا طرز عمل اختیار کرے ۔

سوال :۔ اس نوعیت کے سمجھوتہ کی نوعیت اور نکات کیا ہوں گے ؟

جواب ، گفتگو کے درمیان بات چیت ہو سکتی ہے ۔ بات چیت کے بغیر سمجھوتہ نہیں ہو سکتا ۔ آپس میں مل بیٹھ کر ہی طے پایا جا سکتا ہے ۔"

تاہم اکثر سندھی دانشوروں کا خیال ہے کہ فوج کے ساتھ گفتگو کے ذریعے سندھ کے مسئلے کا حل مشکل ہے کیونکہ فوجی رہنما اس فکری صلاحیت کے مالک نظر نہیں آتے جو اس نوع کے مسائل کو حل کرنے کے لئے درکار ہے ۔ ہماری رائے میں فوج سے گفتگو سندھ کے دانشوروں اور سیاسی کارکنوں کے لئے قابل قبول نہیں ۔ بشمول اُن کے جو جی ایم سید کے پیروکار ہیں ۔ جہاں تک سندھ کے عوام کے معاشی استحصال کا تعلق ہے اِس بارے میں جی ایم سید کی رائے کم از کم جزوی طور پر صحیح معلوم نہیں ہوتی ۔ اگر جی ایم سید کی سندھ کے عوام سے مراد صرف تقریباً ۵۲ فیصد آبادی ہے جو سندھی زبان بولتی ہے تو اُس کے استحصال کی ایک بڑی وجہ مقامی فیوڈل نظام ہے جس کا سندھ کے بالادست طبقات سے تعلق رکھنے والی قیادت کوئی ذکر نہیں کرتی ۔ جہاں تک سندھ یا دوسرے صوبوں کے حقوق کے تحفظ کا مسئلہ ہے یہ آئین اور صوبائی خودمختاری کے اصولوں پر عملدرآمد سے ممکن ہے ۔ اِس کے برعکس جناب سید کی طرف سے جمہوری نظام سے بیزاری کا اظہار استحصالی قوتوں کی حوصلہ افزائی کے مترادف ہے ۔

اب کچھ ذکر جئے سندھ تحریک کی تنظیم کے بارے میں مناسب ہوگا ۔ جئے سندھ تحریک کے بانی جناب جی ایم سید نے اپریل ۱۹۸۵ء میں " سندھو دیش " کے لئے کام کرنے والے طلبا ، مزدوروں ، کسانوں اور دیگر طبقات پر مشتمل تنظیموں کو جئے سندھ تحریک کے متحدہ پلیٹ فارم میں ضم کر دیا ۔ ۲۶ اپریل ۸۵ء کو جئے سندھ تحریک کی ورکنگ کمیٹی بنائی گئی اور ڈاکٹر حمیدہ کھوڑو کو اس کا چیئرمین مقرر کیا گیا ۔ ڈاکٹر حمیدہ کھوڑو کا تعلق سندھ کے ایک نامور زمیندار خاندان سے ہے ۔ اب وہ کچھ عرصے سے دائیں بازو کی قوم پرست راہنما شمار ہوتی ہیں ۔ اُن کی سربراہی پر ورکنگ کمیٹی کے رُکن عبدالواحد اریسر نے سخت اعتراض کیا ۔ جناب اریسر ۱۹۶۸ء میں حیدرآباد میں ایک مسجد کے پیش امام تھے ۔ وہ جی ایم سید کے نظریات سے متاثر ہو کر جئے سندھ تحریک میں شامل ہوئے ۔ بعد ازاں اُن کا جھکاؤ کمیونسٹ نظریئے کی طرف ہو گیا ۔ وہ سوشلزم کا نظام قائم کرنے کے لئے سرمایہ داری کی منزل سے گزرنے کے تصور کے حامی نہیں ۔ جناب اریسر کا گروپ عام خیال کے مطابق صرف مصلحتاً ڈاکٹر حمیدہ کھوڑو کی سربراہی پر متفق ہوا ہے ۔ تاہم جئے سندھ کا مجموعی مزاج اور سوچ یہ ہے کہ سندھ کے قوم پرست طبقات کو طبقاتی مسائل میں نہیں الجھنا چاہیئے ۔ اُن کے خیال میں طبقاتی مسئلے پیدا کر کے سندھیوں کو آپس میں لڑانا قومی تحریک سے دشمنی کے مترادف ہے ۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ خوشحال طبقوں کے اِس تصور کے باوجود سیاسی کارکنوں اور پڑھے لکھے طبقوں میں کمیونسٹ لٹریچر جو سندھی زبان میں بڑی تعداد میں شائع ہو رہا ہے بڑا مقبول ہو رہا ہے ۔ اور اِس کے ساتھ اندرون سندھ میں پنجابی آبادکاروں اور پنجابی طلبا کی جو تنظیمیں قائم کی گئی ہیں اُن کے ردعمل کے طور پر دائیں اور بائیں بازو کی تحریکوں میں باہمی اتحاد قائم کرنے کی کوششیں جاری ہیں ۔

" عوامی تحریک " ایک ایسی سوشلسٹ تنظیم ہے جس نے ایم آر ڈی کی سول نافرمانی کی تحریک کے دوران اپنے ورکروں کی تھوڑی تعداد میں لمبے عرصہ تک گرفتاریاں پیش کر کے اخباری شہرت حاصل کی ۔ سندھ کے متعدد دانشوروں

کی رائے میں اس جماعت کی شہرت اُس کے موجودہ سیاسی اثر سے کہیں زیادہ ہے۔ تاہم یہ بڑی منظم جماعت ہے اور بدین اور ٹھٹھہ کے علاقوں میں انتخابی اہمیت بھی رکھتی ہے۔ عوامی تحریک جی ایم سیّد کو محض ایک وڈیرہ دانشور کا درجہ دیتی ہے۔ اور اُنہیں کسی طبقاتی فکر یا منظم جماعت کا خالق نہیں سمجھتی۔ یہ تحریک جی ایم سیّد کی سوچ سے اِس اعتبار سے بھی مختلف ہے کہ یہ پاکستان کے ریاستی وجود کی مخالف نہیں۔ تاہم اُس کے نظریئے میں یہ وجود چار "قوموں" پر مشتمل ہے۔ اس جماعت کی رائے میں اکیلے سندھ میں سوشلسٹ نظام قائم نہیں ہوسکتا۔ تاآنکہ پورے ملک میں سوشلسٹ نظام قائم نہ ہوجائے۔ یہ تحریک چند دوسرے گروہوں کی طرح یہ مطالبہ بھی کرتی ہے کہ پنجابی آبادکاروں کو جنہوں نے سندھ کی تہذیب اور اُس کے معاشی اور سیاسی مفادات سے غیر مشروط وابستگی اختیار نہیں کی اُنہیں سندھ کی سرزمین چھوڑ دینی چاہیئے۔ دوسری جانب سندھ عوامی تحریک نے ایم آر ڈی میں شمولیت کے لئے اپنے نام سے سندھ کا لفظ خارج کر دیا ہے۔ اور وہ اُسے کل پاکستان بنیادوں پر منظم کرنے پر بھی تیار ہے۔ جہاں تک پاکستان کے لئے آئینی ڈھانچے کا تعلق ہے یہ جماعت سوشلسٹ نظریئے کے مطابق اُن معاملات کو چاروں "قوموں" کی رضاکارانہ گفتگو سے طے کرنے کی حامی ہے۔ اِس جماعت کے جن رہنماؤں سے ملاقات ہوئی اُن سے مجھے یہ تاثر ملا کہ وہ پیریٹی کی بنیاد پر آئینی ڈھانچے کے قائل ہیں۔ اگرچہ اُن کا یہ موقف ایم آر ڈی کی رکنیت سے ہم آہنگ نہیں۔

اِس تحریک کے بارے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ سندھی طالب علموں میں اِس کا کافی اثر موجود ہے۔ خیال ہے کہ عوامی تحریک نے انارکی پھیلانے کا اقدام نہیں کیا۔ بلکہ اِس کے کارکن نظریاتی اور انتظامی ڈسپلن کے پابند نظر آتے ہیں۔ اِس تحریک نے مذہب سے ٹکراؤ کا راستہ بھی اختیار نہیں کیا۔ اگرچہ یہ تحریک کسی مذہبی تائید کی ضرورت محسوس نہیں کرتی تاہم سندھی کلچر کے حوالے سے وہ صوفیانہ، انسان دوست تعلیمات کو تسلیم کرتی ہے۔ سوشلسٹ انقلاب اور ملک کو درپیش موجودہ سیاسی مسائل کے بارے میں اِس جماعت کے نظریات کیا ہیں۔ اس کا کچھ اندازہ جناب رسول بخش پلیجو کے اُس جواب سے ہوتا ہے۔ جو اُنہوں نے ایک اخبار نویس جناب احمد بشیر کے سوال پر دیا۔ جناب احمد بشیر نے سوال کیا کہ

"آپ کا کیا خیال ہے کہ موجودہ قومی صورتِ حال میں صرف مسلح جدوجہد ہی کا راستہ باقی رہ گیا ہے؟"

جناب پلیجو نے جواب دیا۔

"اس کا انحصار اِس بات پر ہے کہ ہمارے ملک میں آخر کار حالات کس رخ سے آگے بڑھتے ہیں۔ اور آئندہ دس سال میں بین الاقوامی صورت حال کیا بنتی ہے۔ ہم فوری طور پر سیاسی لحاظ سے کسی خونی انقلاب کے لئے تیار نہیں ہیں۔ یہ محض مہم جوئی ہوگی۔ اور مہم جوئی ہمیشہ خلاف انقلاب ثابت ہوتی ہے۔ ہمیں قدم بہ قدم آگے بڑھنا ہے۔ سب سے پہلے ہمیں تمام سامراج دشمن طاقتوں کا ایک وسیع تر اور متحدہ پلیٹ فارم تیار کرنا ہے۔ ہمیں ایم آر ڈی کے مقاصد کی حمایت کرنی چاہیئے ہم ایک جمہوری حکومت کے خواہاں ہیں۔ ہم پاکستان کے صوبوں کے لئے زیادہ حقوق اور پاکستان کے شہریوں کے لئے زیادہ آزادی مانگتے ہیں۔ شروع شروع میں جی ایم سید کے سندھو دیش کی میں نے حمایت کی تھی لیکن رفتہ رفتہ مجھ پر یہ حقیقت واضح ہوتی گئی کہ عوام کے لئے اِس فلسفۂ سیاست میں کوئی فائدہ پوشیدہ نہیں ہے۔ میں نے جی ایم سید سے علیحدگی اختیار کر لی اور عوامی تحریک کی بنیاد رکھی"۔

(مذکورہ بالا اقتباس پروفیسر وارث میر کے مضمون مطبوعہ جنگ مورخہ یکم اپریل ۱۹۸۶ء سے نقل کیا گیا)۔

سندھ میں غیر منظم شکل میں ثقہ کمیونسٹ کارکن بھی موجود ہیں۔ جنہیں ہم پہچان کی خاطر پاکستان کمیونسٹ پارٹی کے نام سے پکار سکتے ہیں۔ یہ پارٹی اپنے مخلص رہنما جام ساقی کے حوالے سے پہچانی جاتی ہے۔ یہ ایک طبقاتی تنظیم ہے جو طبقاتی انقلاب لانا چاہتی ہے۔ اپنی جدوجہد کے ابتدائی دور ہی سے یہ پارٹی محنت کش طبقات کے ساتھ ساتھ قومیتوں کے حامی گروہوں کے ساتھ اشتراک عمل کی حامی ہے اور اس میں سامراج دشمن سرمایہ داروں اور پیٹی بورژوا کو بھی شریک کرنا چاہتی ہے۔ سردست اِس کی توجہ کا اولین مسئلہ یہ ہے کہ پاکستان کو مغرب کی استعماری قوتوں کے اثر سے آزاد کرایا جائے اور بائیں جانب رجحان کی حامل خارجہ پالیسی اختیار کی جائے۔

سندھ میں سندھی نیشنلزم کے حامی کچھ مارکسسٹ گروپ عوامی تحریک اور پاکستان کمیونسٹ پارٹی کے پروگرام سے مطمئن نہیں۔ وہ عوامی تحریک کو ایک سچی قوم پرست تحریک تصور نہیں کرتے بلکہ اُسے شاونزم کی حامی تحریک سمجھتے ہیں ان کے خیال میں یہ تحریک غیر مالک مزارعوں کی بجائے چھوٹے مالکان کی تحریک ہے۔ اِس گروپ میں جی ایم سید اور رسول بخش پلیجو سے مایوس ہو کر جُدا ہونے والے کمیونسٹ کارکن شامل ہیں۔

سردست جی ایم سید کا سندھی نیشنلزم کا نظریہ اور عوامی تحریک کا سوشلزم کا نظریہ ہی سندھ کے دو معروف نظریات ہیں جن کی مسابقت حکمرانوں کے روائتی نفاذ شریعت کے نظریئے سے ہے۔ نفاذ شریعت کے بارے میں جو لٹریچر سامنے آیا ہے وہ صرف روائتی مذہبی علماء کی جانب سے ہے اور اُن ہی کا تصورِ اسلام سیاسی اعتبار سے اہمیت اختیار کر چکا ہے۔ پاکستان میں ہزارہا کارکن اِسی اسلامی تصور کے بڑی شدت سے عقیدت مند بن گئے ہیں۔ اُن کی اکثریت پنجابی اُردو اور پشتو بولنے والوں کی ہے۔ جنرل ضیاء الحق مارشل لاء کے دور میں اِسی نظریئے پر عملدرآمد کیا گیا۔ اِس نظریئے کے اہم اجزا کا مختصراً ذکر مناسب ہوگا۔ پہلا عقیدہ یہ ہے کہ سود کو بنکنگ سے خارج کر دیا جائے۔ چنانچہ مارشل لاء کی حکومت کے دعوے کے مطابق متعدد اصلاحات کے ذریعے جون ۱۹۸۵ء تک سود کو بنکنگ سے خارج کر دیا گیا۔ (یہاں اِس سے بحث نہیں کہ سود حقیقتاً خارج بھی ہوا یا نہیں) نفاذِ اسلام کے عمل میں شرعی قانون پر بڑی توجہ دی گئی۔ مروجہ ہزارہا قوانین میں سے ایسے چند قوانین جن کے بارے میں اسلامی فقہ میں پہلے سے ہدایات موجود ہیں انہیں اُن ہدایات کے مطابق ڈھالنے کے اقدامات کئے گئے۔ معیشت کے شعبے میں زکوٰۃ اور عشر کا مخصوص قانون نافذ کیا گیا جس کی رو سے متعدد تمسکات اور بنک کے کھاتوں کے منافع یا سود سے زکوٰۃ کی لازمی کٹوتی کا بندوبست کیا گیا! اسلامی نظریہ کی اِس تاویل میں معیشت کے ڈھانچے کو منصفانہ بنانے، دولت کے وسائل کی وسیع تر اور منصفانہ تقسیم، پسماندہ طبقات کے معیار زندگی کو بہتر بنانے اور رزق حلال کی فراہمی کا بندوبست کرنے کا کوئی تصور موجود نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامائزیشن کے تمام دعوؤں کے باوجود ملک میں بے انصافی، جھوٹ، منافقت اور رشوت ستانی کا زور بڑھا ہے۔ ہمارے مُلک میں اسلامی نظریہ کی جو بھی تاویلیں سیاسی اہمیت کی حامل ہیں وہ تمام کی تمام اِس تصور پر قائم ہیں جو صنعتی دور سے قبل کے زمانے کی معاشرتی ضرورتوں اور معاشی حالات کے مطابق دور وسطیٰ کے فقہا نے قائم کیا تھا۔ آج کے دور میں اولین اہمیت موجودہ معاشرے کو ایک منصفانہ معاشرے کے تصور کے مطابق ڈھالنے کی ہے تاکہ اس معاشرے میں سچے اسلام کی مطلوبہ اخلاقی اور انسان دوست اقدار پیدا ہو سکیں اور لوگوں میں انسانیت اور باہمی اخوت کا جذبہ اُبھرے۔ مگر ہمارے ہاں اِس بنیادی ضرورت کو تسلیم ہی نہیں کیا گیا بلکہ ایک غیر اسلامی اور غیر انسانی معاشرت اور معیشت کو تحفظ دینے کے لئے اسلام

کے حوالے سے غیر اساسی نوعیت کے چند روائتی قوانین نافذ کر دیئے گئے ہیں۔

اِن حالات میں یہ روائتی قوانین ملک میں یکجہتی کا باعث نہیں بن سکتے اور نہ ہی ایسا نظریہ سندھ کے مذکورہ دونوں نظریات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ فی الحقیقت ہوا یہ ہے کہ بعض ایسے علماء مقرروں اور نثر نگاروں نے جن کے پاس کوئی معاشرتی تھیسس موجود نہیں روائتی اسلامی نظریئے کے پلڑے میں اپنا بوجھ ڈال دیا ہے۔ یہ روائتی نظریہ فکری طور پر کاروباری طبقے کے لئے قابلِ قبول ہے۔ کیونکہ اِس نظریئے میں ارتکاز دولت کو توڑنے کی کوئی شرط موجود نہیں اور پھر اس نظریئے میں عبادت پر تو زور ہے لیکن تجارتی اخلاق کی پابندی کا کم از کم عملی طور پر کوئی مطالبہ نہیں۔ متوسط تجارتی طبقے کی حمایت کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ پیپلز پارٹی کے دور حکومت میں متوسط درجے کی صنعتوں کو قومیانے سے چھوٹے تاجر خوفزدہ ہوئے۔ چنانچہ وہ اسلام کی ایسی تاویل کے حامی ہیں جو اُنہیں کسی ایسی صورت حال سے تحفظ دے سکے۔ اِس کے برعکس سندھی زبان بولنے والوں میں متوسط اور بڑا تاجر طبقہ موجود ہی نہیں۔ اِس لئے اسلامی نظام کے روائتی تصور سے وہاں کسی مؤثر گروہ کا مفاد وابستہ نہیں۔

گذشتہ چند سالوں میں روائتی اسلام کی تاویل اور بہت حد تک اِس کا نفاذ عمل میں آچکا ہے۔ چنانچہ اب وہ وقت قریب آگیا ہے جب باشعور لوگ اِس امر پر سوچنے لگیں کہ نفاذ اسلام کے اِس عمل نے غریب عوام کو معاشی انصاف مہیا کرنے اور معاشرے کو کرپشن سے پاک کرنے کے لئے کیا کردار ادا کیا ہے۔ یہ بات بالکل متوقع ہے کہ سوچنے سمجھنے والے حلقے اِس نظریئے سے مایوسی کا اظہار کریں اور معاشرتی اور معاشی ڈھانچے میں بنیادی تبدیلیوں کا مطالبہ کریں۔ سندھ میں یہ سوچ دوسرے صوبوں کے مقابلے میں آگے بڑھ چکی ہے۔ سندھی زبان میں ایسا سوشلسٹ لٹریچر بکثرت چھپا اور مقبول ہوا ہے جو بیک وقت قومیت اور سوشل ملکیت کے نظریات پیش کرتا ہے۔ یہ لٹریچر پڑھے لکھے عوام میں دلچسپی سے پڑھا گیا۔ مگر سندھ کی لیڈر شپ اِس طبقے کے پاس نہیں۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں وہی سندھ میں لیڈر شپ بڑے زمینداروں کے پاس ہے۔ اُن میں کچھ لیڈر قومیت کے مسئلے کو انتہا پسندی کا رنگ دینے کی کوشش کریں گے تاکہ عوام کی تمام تر توجہ صرف قومیت کے مسئلے کی طرف چلی جائے۔ اِس انداز سیاست کو کچھ سوشلسٹ حلقے یقیناً اپنے پروگرام کے لئے مفید تصور کریں گے۔ کیونکہ وہ "قومی جمہوریت" کو "سوشلسٹ جمہوریت" کا پیشرو تصور کرتے ہیں اِس لئے قومیت کے مسئلے کی وجہ سندھ کی سیاست میں اہمیت بڑھ جانے کے وسیع امکانات ہیں۔

کُل پاکستان سطح کی سیاسی قوتیں

دسمبر ۱۹۸۴ء تا مئی ۱۹۸۶ء

اب ہم کُل پاکستان بنیاد پر قائم سیاسی جماعتوں کا جائزہ لیں گے جن کا وجود دیہی سندھ میں قائم ہے۔ اِس تفصیل میں جانے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ ملک کے سیاسی ڈھانچے میں مارشل لاء حکام نے کیا تبدیلیاں کی ہیں۔ کیونکہ فی الحال سیاسی قوتوں کا اِسی ڈھانچے سے واسطہ ہے اور برسرِ اقتدار جماعت مسلم لیگ نے بھی اسی کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔ سیاسی ڈھانچے کی تبدیلیاں فوجی حکام نے مارشل لاء کے دور میں ملکی آئین اور پولیٹیکل پارٹیز ایکٹ میں ترامیم کے ذریعے کی ہیں۔ افسوس ہے کہ یہ صورت حال پیدا کرنے میں سیاسی جماعتوں کی باہمی بے اعتمادی بلکہ معاندانہ رویوں کا بالواسطہ ایک کردار ہے۔ بعض سیاسی جماعتوں کے غیر مصالحانہ رویے کی وجہ سے جولائی ۱۹۷۷ء میں فوج کو حکومت پر قبضہ کرنے کا موقع ملا۔ دائیں بازو کے کچھ گروہوں کی کوتاہ نگاہی جنرل محمد ضیاء الحق کے آمرانہ اقتدار کو طول دینے میں ممد و معاون ثابت ہوئی۔ اِس طویل دورِ حکومت ہی میں فوجی لیڈروں کے لئے یہ ممکن ہوا کہ وہ اپنی پسند کا ایک کنٹرولڈ سیاسی نظام قائم کر دیں۔

ریفرنڈم

۳۱ اکتوبر ۱۹۸۴ء کو جنرل محمد ضیاء الحق نے واضح طور پر اعلان کر دیا کہ وہ سیاسی طاقت عوامی نمائندوں کو منتقل کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے بلکہ اُنہیں اپنے ساتھ اقتدار میں شریک کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اُنہوں نے قانون ساز اسمبلیوں کی طاقت کو قابو میں رکھنے اور

مستقبل کی سول حکومت پر اپنی گرفت مستحکم کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اپنی پسند کی سول حکومت قائم کرنے کی جانب پہلے اقدام کے طور پر اُنہوں نے یکم دسمبر ۱۹۸۴ء کو ایک اہم فیصلہ کیا کہ وہ اسی ماہ کی ۱۸ تاریخ کو ایک ریفرنڈم کرائیں گے۔ اِس ریفرنڈم میں لوگوں کے سامنے یہ سوال پیش کیا گیا کہ وہ ہاں یا نہ میں جواب دیں کہ آیا وہ جنرل ضیاء الحق کے اسلامائزیشن کے اقدامات کی تائید کرتے ہیں۔ ساتھ یہ بھی واضح کیا گیا کہ اثبات میں جواب کی صورت میں جنرل ضیاء الحق پانچ سال کے عرصے کے لئے صدر منتخب تصور کئے جائیں گے۔ دائیں بازو کی دو کالعدم جماعتوں مسلم لیگ (پگاڑہ گروپ) اور جماعت اسلامی نے اِس ریفرنڈم کی حمایت کی۔ باقی تمام قابل ذکر جماعتوں نے بائیکاٹ کیا۔

بائیکاٹ کو خاطر خواہ عوامی تائید حاصل ہوئی تاہم ریفرنڈم سرکاری طور پر کامیاب قرار دے دیا گیا اور یوں جنرل محمد ضیاء الحق ۱۹۹۰ء تک پاکستان کے صدر مملکت قرار پائے۔ ریفرنڈم کے بعد جنرل ضیاء الحق نے عام انتخابات منعقد کرنے کے انتظامات شروع کئے۔ اُنہوں نے انتخاب سے قبل اپنی نشری تقریر میں انتخاب کا مقصد یہ قرار دیا کہ منتخب نمائندہ اسمبلیاں اُن کے جاری کردہ اسلامی نظام کی تکمیل کریں گی۔ یہ انتخاب غیر جماعتی بنیاد پر فروری ۱۹۸۵ء کے آخری ہفتے میں منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور ساتھ ہی انتخاب کے قواعد وضوابط میں تبدیلی کرکے ایسی شرائط نافذ کی گئیں کہ مسلمہ سیاسی راہنماؤں کے لئے الیکشن میں حصہ لینے کے لئے راہیں مسدود ہو جائیں۔ شاید اس خطرے کو محسوس کرتے ہوئے کہ اِس نوع کے الیکشن عوام کو قابل قبول نہ ہوں اور اُن کے خلاف عوامی ردِعمل پیدا ہو جائے حکمران گروہ نے چند ہی دنوں بعد الیکشن کے قواعد میں مزید کچھ ایسی ترامیم کر دیں جن کی رو سے سیاست دانوں کو غیر جماعتی انتخاب میں حصہ لینے کی اجازت ہو گئی۔ انہی دنوں ایم آر ڈی کا اجلاس ایئر مارشل اصغر خاں کی رہائش گاہ ایبٹ آباد میں منعقد ہوا۔ ایم آر ڈی کے بعض رہنماؤں نے اندازہ لگایا کہ جنرل ضیاء الحق سیاسی راہنماؤں کو رعائتیں دینے کے لئے کسی دباؤ کے تحت آگئے ہیں۔ چنانچہ اُنہوں نے مثبت پیش رفت کے لئے گنجائش رکھ کر انتخابات کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔ بائیکاٹ کی ایک وجہ یہ باور کی جاتی ہے کہ اُن کے خیال میں حکمران گروہ مزید رعایت دے کر انتخابات جماعتی بنیادوں پر منعقد کرانے کے لئے تیار ہو جائے گا۔ مگر حکمران گروہ کے لئے کھلے جمہوری نظام کی بحالی قابل قبول نہ تھی ایم آر ڈی کے بائیکاٹ کا فیصلہ جنرل ضیاء الحق کے سیاسی مقاصد کے لئے بڑا مفید ثابت ہوا کیونکہ ایم آر ڈی کے دوسرے اور تیسرے درجے کے متعدد راہنما جنہیں مقامی سطح پر اہمیت حاصل تھی۔ انتخابات میں شرکت کے اہل بن گئے۔ چنانچہ اُنہوں نے ان انتخابات میں حصہ لیا۔ انتخابات میں عام طور پر دولت مند افراد منتخب ہوئے۔ ایک اندازے کے مطابق قومی اسمبلی میں بڑے زمیندار طبقے کی اکثریت ہے۔ اکثر امیدواروں نے انتخابی قواعد کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مقرر کردہ مالی حد سے کہیں زیادہ رقوم صرف کیں۔ نتائج تسلی بخش پاکر حکومت نے اس خلاف ورزی کو معاف کر دیا۔

عام انتخابات کے انعقاد کے بعد اور نو منتخب اسمبلی کے اجلاس سے پہلے ۲ مارچ ۱۹۸۵ء کو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے آئین کی بحالی کا آرڈر جاری کیا۔ جس کی رو سے آئین کی تقریباً پچیس فیصد دفعات میں ترمیم کر دی گئی۔ زیر بحث موضوع کے اعتبار سے اس آرڈر کی قابل ذکر بات یہ ہے کہ صدر مملکت کے

اختیارات میں بڑی توسیع کر دی گئی۔ جس کے نتیجے میں آئین کا اصلی پارلیمانی کردار تبدیل ہو گیا ہے۔ اب صدر مملکت کو وسیع اختیارات حاصل ہو گئے ہیں۔ وہ بہت سے معاملات میں اپنی صوابدید کے مطابق فیصلے کر سکتے ہیں اور کوئی ادارہ یا عدالت اس میں دخل اندازی نہیں کر سکتی۔ خیال رہے کہ صدر مملکت بدستور فوج کے چیف آف آرمی سٹاف بھی ہیں۔ آئینی ترمیم کی رو سے بری بحری اور فضائی افواج کے چیف آف سٹاف مقرر کرنے کا اختیار بھی انہیں حاصل ہے۔ اب صدر مملکت کو وزیر اعظم نامزد کرنے کا اختیار بھی حاصل ہو گیا ہے۔ البتہ نامزد وزیر اعظم کو قومی اسمبلی کا اعتماد حاصل کرنا ہو گا۔ جبکہ قبل ازیں آئین کے تحت وزیر اعظم کا انتخاب قومی اسمبلی کرتی تھی۔ ترمیم کے ذریعے صدر کو یہ اختیار بھی دے دیا گیا کہ وہ صوبائی گورنر اور ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے جج مقرر کریں۔ صدر کو یہ اختیار بھی دیا گیا کہ اعلیٰ عدالتوں کے جج صاحبان کو کوئی دوسرا منصب جس کا وہ تعین کریں سونپ دیں اور اس منصب کے اختیارات کا بھی ازخود تعین کریں۔ ایک ترمیم کی رو سے صدر مملکت کو یہ اختیار بھی حاصل ہو گیا کہ وہ قومی اسمبلی کو توڑ سکتے ہیں۔ ایک دوسری ترمیم کی رو سے صدر کے نامزد صوبائی گورنروں کو یہ اختیارات دیئے گئے کہ وہ صدر کی منظوری سے صوبائی وزرائے اعلیٰ نامزد کریں۔ ہنگامی حالات کے تحت صدر مملکت کو جو اختیارات دیئے گئے وہ ان کے علاوہ تھے۔

آٹھویں ترمیم

نومنتخب قومی اسمبلی نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی جانب سے کی گئی بیشتر ترامیم سے تعرض نہیں کیا۔ البتہ آئین کی آٹھویں ترمیم کے ذریعے صدر کے توسیع شدہ اختیارات میں یہ ترمیم کر دی کہ صدر مملکت وزیر اعظم کو اُس وقت تک برخاست نہیں کریں گے جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ وزیر اعظم نے قومی اسمبلی کا اعتماد کھو دیا ہے۔ صدر کی جانب سے وزیر اعظم نامزد کرنے کے اختیار کو ۱۹۹۰ء تک محدود کر دیا گیا۔ اسی طرح گورنر کی جانب سے وزیر اعلیٰ کی نامزدگی کے اختیار کو ۱۹۸۸ء تک محدود کر دیا گیا اور صدر کے لئے لازمی قرار دے دیا گیا کہ وہ صوبائی گورنر کی تقرری کے مسئلے پر وزیر اعظم سے مشورہ کریں۔ گو مشورے کی پابندی لازمی دکھائی نہیں دیتی۔ فوجی حکمرانوں کے قائم کردہ نئے سیاسی ڈھانچے کی دوسری قابلِ ذکر بات یہ تھی کہ پولیٹیکل پارٹیز ایکٹ میں ترمیم کے ذریعے یہ شرط عائد کر دی گئی کہ صرف وہ سیاسی جماعتیں الیکشن میں حصہ لے سکتی ہیں جو خود کو نظریہ پاکستان کا پابند رکھ کر الیکشن کمیشن کے پاس اپنے آپ کو رجسٹرڈ کروائیں گی۔ منتخب اسمبلی کا کوئی رکن جو کسی غیر رجسٹرڈ جماعت میں شامل ہو اس کی اسمبلی کی رکنیت ختم ہو جائے گی۔ تاہم مئی ۱۹۸۶ء میں نافذ پولیٹیکل پارٹیز ایکٹ کے مطابق ایسی غیر رجسٹرڈ جماعت جو کم از کم اپنے حسابات الیکشن کمیشن کے سامنے پیش کر دے۔ اسے انتخابات میں شرکت کے سوا دوسرے سیاسی عمل میں حصہ لینے کا اختیار حاصل ہے۔

غیر جماعتی اسمبلیوں کے قیام کے بعد جنرل ضیاء الحق نے بوجوہ ایک سیاست دان محمد خاں جونیجو کو وزیر اعظم نامزد کیا۔ جناب جونیجو نے اپنی وزارت کو مستحکم بنانے کے مقصد سے کالعدم مسلم لیگ (جس کے صدر پیر پگاڑہ تھے) کی پارلیمانی پارٹی قائم کر دی۔ جس کے بعد پیر پگاڑہ نے کالعدم پارٹی کی صدارت بھی وزیر اعظم کے سپرد کر دی مسلم لیگ کے نئے صدر نے گورنروں کے نامزد صوبائی وزراء اعلیٰ کو اپنے اپنے صوبے کی کالعدم جماعت کا صدر مقرر کر دیا۔ بعد ازاں قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے ارکان کی بھاری اکثریت مسلم لیگ میں شامل ہو گئی۔ اس پیش رفت کے بعد سیاسی جماعتوں کو جنہوں نے خود کو الیکشن کمشن کے پاس رجسٹر کرا لیا یا کم از کم اپنے حسابات اس کے سامنے پیش کر دیئے، سیاسی عمل کی اجازت دے دی گئی

جو تادم تحریر مئی ۱۹۸۶ء کے اواخر تک جاری ہے۔

سپیکر کی برطرفی

مئی ۱۹۸۶ء میں اس سارے سیاسی ڈھانچے کو سخت دھچکا لگنے کا امکان پیدا ہو گیا جب قومی اسمبلی کے سپیکر سید فخر امام نے تین ماہ کی تاخیر کے بعد حاجی سیف اللہ کا اٹھایا ہوا قانونی مسئلہ آئین کے مطابق چیف الیکشن کمشنر کے سامنے پیش کر دیا تھا کہ وہ جائزہ لیں کہ آیا غیر رجسٹرڈ مسلم لیگ کا عہدیدار بننے کی وجہ سے جناب محمد خاں جونیجو کی قومی اسمبلی کی رکنیت منسوخ ہو گئی ہے یا نہیں۔ خیال رہے کہ جب جناب جونیجو نے مسلم لیگ کی پارلیمانی پارٹی قائم کی اور اُس کے صدر مقرر ہوئے تب یہ جماعت غیر رجسٹرڈ تھی۔ اُس وقت رائج قانون کی رو سے اُن کی قومی اسمبلی کی رکنیت منسوخ ہو جانی چاہیئے تھی۔ مگر قبل ازیں کہ الیکشن کمیشن اِس مسئلے پر غور شروع کرتا صدر مملکت جنرل ضیاء الحق نے ایک آرڈیننس کے ذریعے اِس قانونی سقم کو دور کر دیا اور یوں جناب وزیر اعظم اور اُن تقریباً ۱۴۷ ارکان اسمبلی کو تحفظ ملا جنہوں نے غیر رجسٹرڈ مسلم لیگ کی رکنیت اختیار کی تھی۔ مگر اِس سانحہ سے جناب سپیکر جانبر نہ ہو سکے۔ وزیر اعظم سپیکر کے رویے سے ناراض ہو گئے۔ مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی کی بھاری اکثریت نے اُن کے ایما پر سپیکر کے خلاف عدم اعتماد کا اظہار کر کے انہیں سپیکر کی مسند سے علیحدہ کر دیا۔ اِس کے ردعمل کے طور پر قومی اسمبلی کے ارکان دو دھڑوں میں بٹ گئے اور مسلم لیگ کا مخالف گروہ بعض امور میں اسمبلی کے باہر مخالف سیاسی جماعتوں کے سیاسی موقف میں کشش محسوس کرنے لگا۔ دوم یہ کہ عوام کی نظروں میں مسلم لیگ اور قومی اسمبلی کی وقعت کو گزند پہنچا۔

پیر پگاڑہ

غیر جماعتی انتخابی عمل اور اُس کے نتیجے میں قائم ہونے والی اسمبلیوں کی حیثیت کو مسلم لیگ کے اُس وقت کے صدر پیر پگاڑہ ایک سال قبل یوں بیان کر چکے ہیں۔

> "تمام اختیارات صدر صاحب کے پاس ہیں۔ اِس اسمبلی کو منتخب اسمبلی کہنا سیاسی لحاظ سے غلط ہے۔ صدر صاحب منتخب نمائندوں سے نامزد ارکان کا کام لے رہے ہیں۔ منتخب نمائندے تو وہ ہوتے ہیں جو کسی جماعت کی جانب سے آئے ہوں اور ان کے پیچھے کوئی نظریہ اور پروگرام ہو۔ اُن کے پیچھے کوئی جماعت نہیں ہے۔ یہ تو خدمت گار ہیں۔ میں بھی اُن میں سے ایک ہوں۔"

(بحوالہ جنگ لاہور مورخہ ۳ مئی ۱۹۸۵ء)

مسلم لیگ عرصہ دراز سے پیر پگاڑہ کے ہم خیالوں کا ایک گروہ تصور کی جاتی ہے۔ پیر پگاڑہ جنرل محمد ضیاء الحق کے دور میں فوجی ہیڈ کوارٹرز کے ساتھ اپنے تعلق کا برملا اظہار کرتے رہے ہیں۔ عام خیال کے مطابق وہ سیاسی معاملات میں فوجی حکام کے آلہ کار بنے رہے۔ اُن کے مذکورہ بالا بیان سے ظاہر ہے کہ وہ فوج سے مل کر اپنے لئے سیاسی مقام تلاش کرتے رہے ہیں۔ جہاں تک سیاسی ناموری کا تعلق ہے وہ انہیں پیپلز پارٹی کے دور میں حاصل ہوئی۔ جب اس وقت کی حزب مخالف نے جناب ذوالفقار علی بھٹو کے مقابلے میں انہیں ایک سندھی سیاستدان کے طور پر اہمیت دینی شروع کی۔ خیال رہے کہ آپ ۱۹۶۹ء تک عوامی لیگ سے وابستہ تھے۔

پیپلز پارٹی کے دور میں وہ مسلم لیگ کے صدر مقرر ہوئے۔ اپنے عہد صدارت

میں انہوں نے مسلم لیگ کو منظم نہیں کیا۔ اُن کی کوشش یہی رہی کہ مسلم لیگ اُن کی ذات کے گرد گھومتی رہے۔ انہوں نے سیاسی چٹکلوں اور استعاروں کے ذریعے اپنی رائے کے اظہار سے بڑی شہرت حاصل کی۔ مسلم لیگ کی صدارت سے علیحدہ ہونے کے باوجود پیر پگاڑہ کا سندھ کی وڈیرہ سیاست میں قابلِ ذکر مقام ہے۔ سندھ میں کسی ہیجانی صورت میں اُن کا کردار اہم ہو جاتا ہے۔ اُن کے ہزارہا مسلح حُر مرید نظم و نسق قائم کرنے والے اداروں کے طلب کرنے پر اُن کی مدد کو پہنچ جاتے ہیں۔ اِس لئے دیہی سندھ کی غیر سندھی آبادی جو سیاسی اعتبار سے تو کسی قابلِ ذکر اہمیت کی مالک نہیں کسی متوقع خطرے کے موقع پر پیر پگاڑہ کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتی ہے۔ تاہم دیہی سندھ کے عوام کی بھاری اکثریت اُن کے سیاسی مؤقف کی حامی نظر نہیں آتی۔ میری رائے میں دیہی سندھ میں مسلم لیگ یا پیر پگاڑہ کے گروہ کا مستقبل کچھ روشن نظر نہیں آتا۔ اِس وقت عوام جذباتی انداز میں مس بے نظیر بھٹو کی پیپلز پارٹی سے جڑے ہوئے ہیں۔ جبکہ خواندہ آبادی ایسے نظریاتی رجحانات کی طرف مائل ہے جو مسلم لیگ کے نظریے اور پروگرام سے بالکل مختلف ہیں۔ حکمران جماعت مسلم لیگ کا طبقاتی کیریکٹر فیوڈل ہے اور اُس سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ سندھ میں کوئی بنیادی نوعیت کی زرعی اصلاحات کرے گی۔ اِس کے برعکس توقع یہ ہے کہ جوں جوں سندھ کے غریب عوام میں انقلاب پسندی کا رجحان بڑھے گا۔ دائیں بازو کی سیاسی جماعتوں میں فوج سے وابستگی کا احساس بڑھے گا۔

وڈیرہ سیاست

اب ہم سندھ کی گذشتہ ڈیڑھ سال کی وڈیرہ سیاست کا جائزہ لیں گے۔ دیہی سندھ میں فروری ۱۹۸۵ء کے غیر جماعتی انتخابات میں کامیاب ہونے والے اُمیدواروں کا تعلق عام طور پر بڑے زمیندار طبقے سے ہے۔ بڑے زمینداروں نے اپنے مخصوص مفادات کے تحت انتخابات میں حصہ لیا۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں دیہی سندھ کے معاشرتی ڈھانچے کے سبب یہاں کی سیاسی طاقت بڑے زمینداروں کے پاس رہی ہے۔ خیال رہے کہ قبائلی سردار اور بڑے پیر بھی اسی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ سندھ کے بڑے زمیندار عموماً برسرِ اقتدار گروہ میں شامل رہے ہیں۔ حکمرانوں نے جس سیاسی جماعت کو پسند کیا عام طور پر زمیندار رہنما اُسی جماعت میں شامل ہو گئے ہیں۔ وڈیرے کی طاقت کو سن پچاس اور ساٹھ کی دہائیوں میں ہاری تحریکوں نے چیلنج کیا۔ پیپلز پارٹی نے ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے لئے جو سیاسی مہم جاری کی اُس سے وڈیروں کا سماجی احترام متاثر ہوا۔ مگر پھر وڈیروں نے پیپلز پارٹی میں شامل ہو کر اپنی پوزیشن کو مستحکم بنا لیا۔ ساتھ ہی اُن کے تعلیم یافتہ بچوں نے سرکاری ملازمتیں اختیار کر کے انتظامی اختیارات کے ذریعے خود کو سہارا دینے کی کوشش کی۔

مارشل لاء کے دور میں وڈیرہ سخت ذہنی کشمکش میں مبتلا رہا ہے۔ وہ حکومت کے ساتھ ٹکراؤ کا راستہ اختیار نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہ راستہ اختیار کرنے سے وہ سرکاری حلقوں اور مقامی انتظامیہ کے لئے ناپسندیدہ بن جاتا ہے جبکہ معاشی اور سیاسی مفادات کے تحفظ کے لئے اُسے اُن کے تعاون کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مارشل لاء کے دور میں بہت سے سیاسی راہنماؤں نے اپنے عزیز و اقارب کو لوکل باڈیز کے اداروں اور مارشل لاء حکام کی مقرر کردہ غیر منتخب مجلس شوریٰ کی رکنیت اختیار کرنے پر آمادہ کیا۔

دوسری جانب اُسے عوام میں اُبھرتی ہوئی قومیت پرستی کی سیاسی قوت کا

پورا اندازہ تھا۔ چنانچہ اُس نے سیاسی میدان میں سوچ کے اُس ابھرتے ہوئے دھارے سے بھی اپنی وابستگی قائم رکھی۔ اس صورت حال کا فطری تقاضا تھا کہ وہ جمہوری عمل کا مطالبہ کرتا رہے تاکہ قومیت پرستی اور انقلابی تحریکوں کی قوت اتنی نہ بڑھنے پائے جو اُس کے مفاہمت پسندانہ سیاسی رویے کے لئے خطرے کا باعث بن جائے۔ دوسری جانب حکمران طبقہ نے یہ چاہا کہ وڈیرے کو حکومت کے سیاسی عزائم کی تکمیل کے لئے ہمنوا اور آلہ کار بنایا جائے۔ فروری ۱۹۸۵ء کے انتخابات سے قبل ہم نے فوجی حکومت کے خیرخواہ دانشوروں کا یہ تجزیہ سُنا کہ سندھ کے کچھ وڈیروں کو حکومت میں شامل کر کے اور دیہی سندھ میں معاشی پروگرام جاری کر کے رائے عامہ کو آہستہ آہستہ مطمئن کیا جا سکتا ہے تاکہ وہ پیپلز پارٹی سے کٹ جائیں۔ وڈیرے کو زیر اثر رکھنے کے لئے حکومت کے پاس بڑی طاقت اور بہت سامواد موجود تھا۔ بعض وڈیروں پر فوجداری مقدمات تو تحریک سول نافرمانی کے دوران ہی قائم ہو چکے تھے۔ پھر کچھ وڈیروں نے زرعی اصلاحات کی خلاف ورزیاں کر رکھی تھیں۔ بعض وڈیروں پر زرعی قرضوں کی بھاری رقوم واجب تھیں وڈیرہ اس نوع کا دباؤ دیر تک برداشت نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ وڈیرے رہنماؤں کی ایک بڑی تعداد حکومت کی ہمنوا بننے پر تیار ہو گئی۔ یہ بات بالکل عیاں ہے کہ حکومت چاہے کتنی ہی غیر مقبول ہو اگر اُسے مسند اقتدار سے ہٹایا نہیں جا سکتا تو عام وڈیرہ اُس سے تعاون پر خود کو مجبور پائے گا۔

۱۸ دسمبر ۱۹۸۴ء کے ریفرنڈم کے سرکاری نتیجے کے اعلان کے بعد ایسے زمیندار جو پیپلز پارٹی سے منسلک نہ رہے تھے یہ باور کر کے کہ جنرل ضیاء الحق صدر بن چکے ہیں اور عوام میں فوجی حکومت کی پالیسی کی مزاحمت کی سکت نہیں اور یہ کہ فوجی حکومت کسی بھی شکل میں اپنے مخالفوں کو اقتدار منتقل کرنے پر رضامند نہ ہوگی۔ وہ سب جنرل ضیاء الحق کے غیر جماعتی انتخابی عمل میں شریک ہو گئے۔

انتخابات کا تجزیہ

اب سوال یہ ہے کہ عوام کی قابل ذکر تعداد نے انتخابات میں حصہ کیوں لیا۔ اُس کی سب سے ثقہ وجہ وزیر اعظم جناب محمد خاں جونیجو نے مارشل لاء اٹھنے سے قبل قومی اسمبلی میں بیان کی۔ اُنہوں نے کہا کہ غیر جماعتی انتخابات میں عوام نے اس مقصد سے ووٹ ڈالے کہ اس طرح مارشل لاء اٹھنے کی راہ ہموار ہوگی۔

فروری ۱۹۸۵ء کے غیر جماعتی انتخابات کے نتیجے میں جو سول حکومت قائم ہوئی اُسے ہم ایک تابع اور ادھورے جمہوری نظام ہی کا حصہ قرار دے سکتے ہیں۔ جمہوریت ایک وسیع تصور ہے۔ عام انتخاب اس کا صرف ایک ادارہ ہے۔ جمہوری انتخاب کی بھی یہ شرط ہے کہ لوگ پروگرام کے حوالے سے اپنے نمائندے منتخب کریں۔ ظاہر ہے کہ فروری ۱۹۸۵ء کے الیکشن غیر جماعتی ہونے کی بناء پر کسی پروگرام سے عاری تھے چنانچہ ہمارے خیال میں سندھ کے جن نمائندوں نے ایسے ادھورے جمہوری عمل میں شرکت کی ہے اُنہوں نے عارضی طور پر تو اپنے ذاتی اور طبقاتی مفادات کو تحفظ دینے کا سامان کیا ہے تاہم وہ مستقبل میں سندھ کے عوام کی نظر میں اپنا مقام بحال نہیں رکھ سکیں گے۔ میری رائے میں سندھ کے عوام میں سندھی قومیت کا شعور اتنا گہرا ہو چکا ہے کہ اب اُنہیں زیادہ عرصہ تک جمہوری نظام اور صوبائی حقوق سے محروم نہیں رکھا جا سکتا۔ اگرچہ حزب مخالف سے تعلق رکھنے والے کچھ وڈیروں نے اپنا موقف حکومت کے حق میں بدل لیا ہے مگر وہ عوام

سے اُن کا شعور ہرگز نہیں چھین سکیں گے۔ تاریخ گواہ ہے کہ قومیت کے حوالے سے حاصل کیا ہوا جمہوری شعور کبھی پیچھے واپس نہیں گیا۔

ماسوائے بعض خوش فہم افراد کے کوئی بھی صاحب نظر آدمی اِس خام خیالی میں مبتلا نہیں ہوسکتا کہ مسلم لیگ یا اِس نوع کی کوئی دوسری جماعت قوم کے مسائل حل کر کے عوامی مقبولیت حاصل کرے گی۔ یہ مسلمہ بات ہے کہ جب تک نااہلی اور لوٹ مار کو فروغ دینے والا موجودہ انتظامی اور معاشی ڈھانچہ قائم ہے، قومی مسائل حل نہیں ہوسکتے۔ حتیٰ کہ اگر حکومت کا انصرام کسی مقبول عام جماعت کو بھی حاصل ہو جائے تو اِس ڈھانچے کی موجودگی میں وہ بھی جلد ہی ناکام اور بدنام ہو جائے گی۔ اگرچہ اِس بارے میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے ملک کے قدرتی وسائل یقیناً اِس قابل ہیں کہ عوام کو خوشحالی اور معاشی استحکام حاصل ہوسکتا ہے۔ مگر یہ سب کچھ غیر جمہوری طرز حکومت اور مروجہ انتظامی اور معاشی ڈھانچے کی موجودگی میں ہرگز ممکن نہیں۔

پیپلز پارٹی

سندھی بولنے والے عوام کی مقبول ترین سیاسی جماعت پیپلز پارٹی ہے جس کی سربراہ مس بے نظیر بھٹو ہیں۔ یہ پارٹی پاکستان کی واحد سیاسی جماعت ہے جس کے پیروکار اور حامی ملک کے چاروں صوبوں میں بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ اِس پارٹی نے ۱۹۷۳ء میں نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیت العلمائے اسلام کے ساتھ مل کر ملک کو پارلیمانی آئین دیا۔ جس میں صوبوں اور مرکز کے اختیارات کی تقسیم کے مسئلے کو تمام جماعتوں کے ساتھ افہام و تفہیم کے ساتھ طے کیا۔ مگر ۱۹۸۳ء کی تحریک بحالی جمہوریت کے بعد اب یہ جماعت، ایسوسی ایشن کی اکثر دوسری جماعتوں کی طرح، صوبائی اختیارات میں مزید توسیع کی حامی ہو چکی ہے۔ فکری رجحان کے اعتبار سے یہ ایک سیکولر مزاج کی جماعت ہے۔ اگرچہ اسلام کے ساتھ بھی اپنے عقیدے کا برملا اظہار کرتی ہے۔

معاشی پروگرام کے اعتبار سے یہ پارٹی سوشلسٹ ہونے کا دعویٰ کرتی ہے جس سے اُس کی مراد یہ ہے کہ ایک مخلوط معیشت میں پبلک سیکٹر کا کردار بڑھایا جائے۔ یہ پارٹی پیداواری وسائل نجی شعبے کے چند ہاتھوں میں مرتکز کرنے کے خلاف ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو کے دورِ حکومت میں نجی سرمایہ کاری کا عمل سست پڑ گیا تھا۔ مس بے نظیر کے حالیہ بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ قوم پرست صنعت کاروں کی نجی سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی کا نظریہ رکھتی ہیں۔ تاکہ روزگار کے مواقع پیدا ہوں۔ اُنہوں نے صنعتوں کے شعبے کی کارکردگی کو بہتر بنانے کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ اور سرمایہ کاری کی راہ میں رکاوٹیں دور کرنے کا بھی اعلان کیا ہے۔ مس بے نظیر بھٹو غیر ملکی قرضوں کی مخالفت کی بجائے اُن کے بہتر استعمال کے نظریے کی حامی ہیں۔ لیبر پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے اُنہوں نے جہاں کمزور طبقے کی حمایت جاری رکھنے کا جذباتی انداز میں اعلان کیا۔ وہاں طبقاتی کشیدگی ختم کرنے کی ضرورت بھی تسلیم کی۔ مس بے نظیر بھٹو نے صنعتی مزدوروں کے معاملے میں صرف تنخواہوں میں اضافہ کے اعلان پر قناعت کی ہے۔ دوسری طرف زرعی شعبے میں بنیادی تبدیلی کا ذکر نہیں کیا۔ یہ تاثرات میں نے اُن کے اپریل ۱۹۸۶ء میں اخباری بیانات سے اخذ کئے ہیں۔

گذشتہ سال فروری ۱۹۸۵ء میں منعقدہ عام انتخابات کے نتائج سے پیپلز پارٹی سمیت حزب مخالف کی سب جماعتیں حیرت میں مبتلا ہوگئیں۔ اُنہوں نے دیکھا کہ عوام کی بڑی تعداد نے اُن کی بائیکاٹ کی اپیل کے باوجود الیکشن میں حصہ لیا۔ جس سے اُن کی بڑی دل شکنی ہوئی اور اُن میں سے اکثریت کو یہ یقین ہونے لگا کہ مستقبل قریب میں اُن کے اقتدار میں آنے کے مواقع مخدوش ہو گئے ہیں۔ پیپلز پارٹی کی صوبائی لیڈر شپ کا بڑا حصہ فروری ۱۹۸۵ء کے

غیر جماعتی انتخابات میں حصہ لینے کا حامی تھا۔ انہیں یقین تھا کہ وہ اپنے ذاتی اثر و رسوخ کی وجہ سے انتخابات جیت سکتے ہیں اور یوں اپنے طبقاتی مفادات کو بہتر تحفظ دے سکتے ہیں۔ مگر ایم آر ڈی کے سربراہوں کے بائیکاٹ کے فیصلے کی وجہ سے وہ انتخاب میں شرکت سے محروم رہ گئے۔ اس عرصے میں پیپلز پارٹی کی ہائی کمان کی جانب سے صوبائی تنظیم میں ایسے ورکروں کو پارٹی کے چند کلیدی عہدوں پر نامزد کیا گیا جو صوبائی صدر جناب غلام مصطفیٰ جتوئی (جو خود بھی نامزد تھے) کے لئے قابل قبول نہ تھے۔ صوبائی لیڈر شپ نے محسوس کیا کہ وہ دونوں طرف سے پس رہے ہیں۔ حزب مخالف میں رہنے کی وجہ سے وہ اقتدار میں شرکت سے محروم ہو چکے ہیں اور دوسری طرف خود اپنی جماعت میں اُن کے نزدیک ناپسندیدہ سیاسی ورکروں کو اوپر لاکر اُن کے اقتدار کو محدود کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ انہوں نے ہائی کمان کے فیصلوں سے اختلاف کیا۔ اور یوں صوبہ سندھ کی پیپلز پارٹی یک گونہ انتشار کا شکار ہوئی۔ راقم کی رائے میں یہ انتشار پارٹی کے کارکنوں کو خاصی حد تک متاثر کر سکتا ہے۔ مگر عوام میں اس کا کوئی قابلِ ذکر اثر مرتب نہ ہوگا اور اُن کی جذباتی تائید بدستور پارٹی کی ہائی کمان کو حاصل رہے گی۔ یہی سندھ کی سیاست کے حوالے سے ہائی کمان کے طے کرنے کا ایک اہم مسئلہ بنیادی زرعی اصلاحات کا ہے۔ سابقہ دور میں پیپلز پارٹی کی وڈیرہ لیڈر شپ زرعی معیشت میں محض سطحی تبدیلی کی حامی رہی۔ مگر عوام اب توقعات اور مطالبات کے معاملے میں زیادہ دور جا چکے ہیں اور اگر پارٹی ہائی کمان نے اقتدار حاصل کر کے زرعی اصلاحات کے پروگرام کے بارے میں عوام کی توقعات کو پورا نہ کیا تو وہ یقیناً اپنی مقبولیت کھو دے گی۔ عوام میں اس جماعت کی مقبولیت کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اسے انقلابی تصور کیا جاتا ہے۔ اگر یہ جماعت خود کو عملی طور پر انقلابی ثابت نہ کر سکی۔ تو عوام اس جماعت کو ترک سکتے ہیں مگر انقلاب کے مطالبے کو نہیں۔

اس پارٹی کی سب سے نمایاں کمزوری یہ ہے کہ یہ سردست جمہوری انداز میں منظم نہیں۔ چنانچہ اسے ایک سیاسی گروہ یا تحریک کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ یہ گروہ مرحوم ذوالفقار علی بھٹو اور اُس کے خاندان کی مقناطیسی کشش کی بنیاد پر مجتمع ہے۔ جسے انہوں نے متوقع انقلاب کا نشان قرار دے رکھا ہے۔

مئی ۱۹۸۶ء میں پارٹی کے رہنماؤں کی جانب سے جو بیانات شائع ہوئے ہیں اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ پیپلز پارٹی کو مضبوط تنظیم بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ واضح کرنے کی ضرورت ہے کہ مضبوط تنظیم سے کیا مراد ہوتی ہے۔ ایک جمہوری پارٹی کی مضبوطی عہدے داروں کے باقاعدہ انتخاب، اہم معاملات میں اجتماعی سوچ بچار اور کثرت رائے سے فیصلوں پر قائم ہوتی ہے۔ کسی پارٹی کا جمہوری کردار مستقلاً قائم رہنا اس بات پر منحصر ہے کہ وہ اس قدر فکری اور تنظیمی صلاحیت کی مالک ہوتا کہ اقتدار حاصل کرنے کے بعد اپنے پروگرام کو عملی جامہ پہنا سکے۔ خیال رہے کہ اس جماعت نے عوام کی توقعات کو بہت بلند کر رکھا ہے۔ جس کو پورا کرنا اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ مروجہ معاشی اور انتظامی ڈھانچے میں بنیادی تبدیلیاں نہ کی جائیں۔ ہر ذی ہوش سوال کرتا ہے کہ آیا پیپلز پارٹی ایسی بڑی تبدیلیاں برپا کرنے کی ضروری صلاحیت کی مالک بن سکے گی۔ اس ضمن میں پہلی شرط یہ ہے کہ یہ جماعت جمہوری انداز میں اپنے آپ کو منظم کرے۔ دوسری یہ کہ تبدیلی کے عمل کو سرانجام دینے کے لئے دوسری ہم خیال جماعتوں کا عملی تعاون حاصل کرے۔ یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ پاکستان کے بوسیدہ معاشرتی ڈھانچے کو تحفظ دینے والی سیاسی اور ریاستی قوتیں ابھی تک بہت مضبوط ہیں اور تبدیلی کی دعویدار سبھی ہم خیال جماعتوں

کی مشترک جدوجہد ہی سے اُن کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ شرائط پوری کئے بغیر اگر پیپلز پارٹی کو اقتدار مل گیا تو جمہوری اداروں کی کمزور کارکردگی کی بنا پر یہ پارٹی اپنے پہلے زمانہ حکومت کی طرح اقتدار کے دوام کے لئے فوج، انتظامیہ اور مالی امداد دینے والے غیر ممالک کے رحم وکرم پر تکیہ کرنے پر مجبور ہوگی۔ اِس کے نتیجے میں بہت سی خرابیاں پیدا ہوں گی۔ ایسی خرابیاں جو بنیادی طور پر جمہوری تنظیم کے فقدان کی وجہ سے رونما ہوں گی وہ سندھ میں پنجاب کو مزید بدنام کرنے کا باعث ہوں گی۔ کیونکہ دیہی سندھ کے عوام میں پیپلز پارٹی کی مقبولیت بھٹو خاندان کی محبت کی وجہ سے ہے۔ مگر اِس جماعت کی خرابیوں کی ذمہ داری پنجابیوں پر عائد کی جاتی ہے۔ کیونکہ پنجاب پیپلز پارٹی کی طاقت کا مرکز تصور کیا جاتا ہے۔

دوسری سیاسی قوتیں

سندھ میں اگست ۱۹۸۳ء میں ایم آر ڈی ایک بڑی سیاسی قوت کے طور پر ابھری۔ پیپلز پارٹی کے علاوہ دیہی سندھ کے کچھ حصوں میں تحریک استقلال، جمعیت العلمائے اسلام اور سندھ عوامی تحریک نے قابلِ ذکر کردار ادا کیا۔ عوامی تحریک سردست کل پاکستان بنیادوں پر قائم نہیں۔ کل پاکستان بنیاد پر قائم ایم آر ڈی کی جن دوسری جماعتوں کا وجود دیہی سندھ میں قائم ہے اُن میں تحریک استقلال اور جمعیت العلمائے اسلام قابلِ ذکر ہیں۔ تحریک استقلال کی قیادت خان محمد جمالی اور دوسرے نوجوانوں کے پاس ہے۔ جو عام طور پر زمیندار خاندانوں اور وکالت کے پیشہ سے تعلق رکھتے ہیں اِس جماعت کی قیادت ترقی پسند معاشی اور وسیع تر صوبائی اختیار کے پروگرام پیش کر کے اپنا مقام پیدا کرنے کے لئے جدوجہد میں مصروف ہے۔ تحریک استقلال کے علاوہ جمعیت العلمائے اسلام بھی پاکستان کے فیڈرل ڈھانچے کی قائل ہے۔ مذہبی جماعت ہونے کے باوجود یہ پارٹی نسبتاً مذہبی رواداری کی حامی ہے۔ اِس کا معاشی پروگرام مولانا عبید اللہ سندھی کی تعلیمات کے زیر اثر ہے۔ جنہیں وہ امام الانقلاب کہتے ہیں۔ چنانچہ یہ پارٹی معاشی پروگرام میں بائیں جانب کے رجحانات کی حامل ہے۔ اِس کے رہنماؤں کی سوچ سندھی قومیت کے نظریہ سے متاثر ہے۔ اِس جماعت کے صوبائی امیر مولانا شاہ محمد امروٹی نے ایم آر ڈی کی تحریک میں اہم کردار ادا کیا۔ جبکہ سندھ کے علماء میں اِس جماعت کے مولانا عبدالکریم بیرو والے کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ مساجد کے سینکڑوں امام اُن کے شاگرد یا اُن کے حلقہ اثر سے وابستہ ہیں۔ متعدد اضلاع میں اُن کے چھوٹے بڑے مدارس قائم ہیں۔ سکھر، شکارپور، جیکب آباد اور کسی حد تک لاڑکانہ میں اِس جماعت کی قابلِ ذکر حمایت موجود ہے۔

راقم کی رائے میں بائیں بازو کی ایک ایسی جماعت جو طبقاتی تقسیم کی بجائے تمام طبقات کی مشترک جدوجہد کے ذریعے معاشرتی اور اقتصادی ڈھانچے میں بنیادی تبدیلی کا پروگرام پیش کرے۔ اُس کے لئے دیہی سندھ میں موزوں سیاسی فضا موجود ہے اگر بائیں بازو سے تعلق رکھنے والی سیاسی جماعتیں متحد ہو کر ایک جماعت بنالیں تو ایسی جماعت زبردست طاقت بن کر اُبھر سکتی ہے۔ اُس کے سامنے سندھ، بلوچ، پشتون فرنٹ اپنی بیشتر اہمیت کھو دے گا۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ بائیں بازو کا اتحاد قومیت کے موقف کو اپنا کر اور اُس میں ریڈیکل معاشی پروگرام شامل کر کے بڑی مقبولیت حاصل کر سکتا ہے۔

ایم آر ڈی

اگست ۱۹۸۳ء میں ایم آر ڈی کی تحریک سول نافرمانی نے عوام کی سوچ پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔ ایم آر ڈی کی تحریک کے دوران سندھ کے بڑے زمیندار دو گروہوں میں

بٹ گئے تھے ایک گروہ کھلے یا پوشیدہ طور پر حکومت کا طرفدار تھا۔ عام دیہی سندھی اس گروہ سے کم از کم ولی طور پر بیزار ہے۔ اگرچہ سماجی بندھنوں میں گرفتار ہونے کے باعث وہ اپنی رائے کا کھلا اظہار کرنے سے معذور ہے۔ دوسرا گروہ سول نافرمانی کی تحریک میں اس اُمید پر شامل ہوگیا تھا کہ اُس کے اندازے کے مطابق حکومت جلد ہی تبدیل ہونے والی ہے چنانچہ اُس نے اپنے قبیلے کے علاوہ باریوں اور عام لوگوں کو تحریک میں شمولیت پر اکسایا۔ مگر بعد میں جب حکومت نے سخت اقدام کئے تو یہ گروہ ڈر گیا یا قید کر دیا گیا۔ عام خیال کے مطابق بہت سے قید ہونے والوں نے درپردہ معافی مانگ کر رہائی حاصل کی۔ نتیجتاً سندھ کے بڑے زمینداروں کے بارے میں عوام کا مجموعی رویہ کم از کم پوشیدہ طور پر معاندانہ ہو چکا ہے اور یہی ایک وجہ ہے کہ عام لوگ وڈیروں کی بجائے براہ راست بھٹو خاندان سے اپنا جذباتی تعلق قائم کر چکے ہیں۔ پنجاب کے عوام کی طرح سندھ کے عوام میں بھی ایم آر ڈی کی مجموعی ہیئت کے بارے میں بہت سے شکوک اور شکایتیں پائی جاتی ہیں۔ عوام کے خیال کے مطابق ایم آر ڈی کی کچھ جماعتوں نے مارشل لاء لگوانے میں درپردہ کچھ نہ کچھ کردار ادا کیا تھا۔ تاہم یہ شکایات فروری ۱۹۸۵ء کے انتخابات سے پہلے دبی رہیں۔ انتخابات کے بعد لوگوں نے دیکھا کہ ایم آر ڈی ۱۹۷۳ء کے آئین کے تحفظ اور اس آئین کے مطابق انتخابات کرانے میں کامیاب نہیں ہوئی تو اُن کی نظروں میں ایم آر ڈی کی وقعت کم ہوگئی۔ اگرچہ ایم آر ڈی کے رہنما جمہوریت کی خاطر باہمی تعاون کی اہمیت پر زور دیتے رہے ہیں۔ لیکن لوگوں کی ایک بڑی تعداد جو پیپلز پارٹی سے جذباتی طور پر منسلک ہے اس اہمیت کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ شاید اسی عوامی رجحان کے پیش نظر مس بے نظیر بھٹو نے اپریل ۱۹۸۶ء میں عوام کے ساتھ رابطے کی مہم کے دوران ایم آر ڈی کے پلیٹ فارم اور اس کے رہنماؤں کے ساتھ ملاقات سے گریز کیا۔ بظاہر اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ایم آر ڈی کی اکثر جماعتیں پیپلز پارٹی سے انتخابی اتحاد اور مشترک پروگرام کا مطالبہ کرتی رہی ہیں جو پیپلز پارٹی کے لئے قابلِ قبول نہیں۔ پیپلز پارٹی کے لئے ایسا اتحاد یقیناً اس اعتبار سے بظاہر غیر ضروری تھا کیونکہ عوام ایم آر ڈی کے مقابلے میں بھٹو خاندان سے جذباتی طور پر منسلک تھے۔ اس کا عملی مظاہرہ اُن جلسے اور جلوسوں میں ہوا جن میں مس بے نظیر بھٹو نے شرکت کی۔ راقم کی رائے میں بے نظیر بھٹو کے جلسوں کی حاضری ایم آر ڈی کی گیارہ جماعتوں کے مشترک جلسوں کی مجموعی حاضری سے تقریباً پانچ چھ گنا زیادہ تھی۔ تاہم پیپلز پارٹی کی طرف سے ایم آر ڈی کے پلیٹ فارم اور اُن کے رہنماؤں سے اجتناب کا تاثر دور رس غلط فہمی کا باعث بنا۔ ایم آر ڈی کی بیشتر جماعتیں جائز طور پر پیپلز پارٹی کے اوّلین دور اقتدار کو آمرانہ طرز کا حامل قرار دیتی ہیں۔ چونکہ اب بھی اس کی عوامی مقبولیت کا انحصار اُس کے جمہوری کردار پر نہیں اس لئے ایم آر ڈی کی دوسری جماعتیں پیپلز پارٹی کے تنظیمی اعتبار سے غیر جمہوری کیڈر سے آمرانہ رجحانات کا خطرہ محسوس کرتی ہیں۔

راقم کی رائے میں ایم آر ڈی میں ممکنہ پھوٹ جمہوریت کے فروغ کی راہ میں مشکلات پیدا کرے گی۔ کیونکہ غیر سیاسی ریاستی طاقتیں جو قومی سیاست میں اپنا کردار یا کم از کم اعلیٰ اقتدار قائم رکھنا چاہتی ہیں اُنہیں متعدد سویلین سیاسی گروہوں کی حمایت حاصل ہے۔ اندرون ملک کی یہ تمام قوتیں اپنی موید بیرونی حکومت سے مل کر ملک میں جمہوری نظام کے فروغ کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کر سکتی ہیں۔

اوائل مئی میں مس بے نظیر بھٹو نے اس خدشے کا اظہار کیا کہ اُن کے خلاف ایک سازش تیار کی گئی ہے۔ اُنہیں گرفتار کر کے اور پیپلز پارٹی کے ناراض دھڑے کو سیاسی قوت مجتمع کرنے کی سہولت دے کر وسط مدتی

الیکشن منعقد کر لیا جائے گا۔ اگر اِس نوع کی کسی سکیم پر عمل ہوا تو ہو سکتا ہے پیپلز پارٹی کی جانب سے سول نافرمانی کی تحریک جاری کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہاں بیسیوں سوال ذہن میں اُبھرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ ایسی تحریک کو سندھ کے باہر دوسرے صوبوں میں کتنی تائید حاصل ہوگی، حکومتی مشینری اِس تحریک کو روکنے میں کتنی مؤثر ہوگی، دوسری سیاسی جماعتوں کا رویہ کیا ہوگا، کیا یہ تحریک پُرامن رہے گی کیا کہیں تشدد اور فساد تو رونما نہیں ہوگا۔ اِن تمام خدشات و امکانات کا اندازہ لگانا بوقت تحریر آسان نہیں۔ اور نہ ہی اُن کے نتائج کے بارے میں کوئی حتمی بات کہی جا سکتی ہے۔ تاہم راقم کو اِس بارے میں کوئی شک نہیں کہ اگر ایسی کسی سکیم پر عمل کیا گیا تو وسط مدتی الیکشن ہوں یا نہ ہوں سندھ کے عوام میں مرکز گریز رجحانات مزید تیز ہو جائیں گے اور پیپلز پارٹی کے بہت سے کارکن ردِعمل کے طور پر ایسی جماعتوں سے منسلک ہو جائیں گے جو انتہا پسند سوچ اور پروگرام کی حامل ہیں۔ خیال رہے کہ مئی ۱۹۸۶ء میں دیہی سندھ کے انتہا پسند گروہ پیپلز پارٹی کی پاپولر تحریک سے مرعوب ہو کر خاموش اور دبکے بیٹھے ہیں۔ وہ اپنے سیاسی مقاصد کے لئے پیپلز پارٹی کو سب سے بڑی سیاسی رکاوٹ تصور کرتے ہیں۔ اگر حکمرانوں نے ایسی کسی سکیم پر عمل کیا جس کی جانب مس بے نظیر بھٹو نے اشارہ کیا ہے تو وہ انتہا پسند گروہوں کی راہ میں حائل بڑی سیاسی رکاوٹ دور کر دیں گے۔ ہماری معلومات کے مطابق پیپلز پارٹی کے اندر بھی متعدد رہنما کنفیڈریشن کے نظریے سے متاثر ہیں وہ بھی انتہا پسند رویے پر گامزن ہو جائیں گے۔

بحث کا ماحصل

مذکورہ بالا بحث کا ماحصل یہ ہے کہ فوجی حکام کے مختلف اقدامات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ قومی سیاست کو ایک مخصوص انداز میں ڈھالنا چاہتے ہیں۔ آئینی ترامیم سے جنرل محمد ضیاء الحق کے ہاتھ میں ریاستی طاقت کا زبردست ارتکاز واقع ہو چکا ہے۔ آثار بتاتے ہیں کہ حکمران جماعت مسلم لیگ پاپولر ہونے یا کامیاب سیاسی طاقت بننے کی صلاحیت سے عاری ہے۔ جہاں تک مخالف جماعتوں کا تعلق ہے اُن میں متعدد باہمی بدگمانیاں پائی جاتی ہیں اور باہمی اعتماد کا فقدان ہے۔ مُلک کی سب سے بڑی سیاسی جماعت پیپلز پارٹی ہے جو مُلک کے اتحاد کا موجب ہو سکتی ہے مگر یہ مقبول عام پارٹی فی الحال جمہوری نظم سے عاری ہونے کی بنا پر مروجہ نظام میں درکار ایسی بنیادی تبدیلیاں پیدا کرنے کی صلاحیت سے محروم ہے جو مُلک کے استحکام کے لئے لازمی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقتدار حاصل ہونے کی صورت میں وہ خود آمریت کی راہ پر گامزن ہونے پر آمادہ ہو سکتی ہے۔ اور اگر اِس جماعت کو سیاست سے بیدخل کرنے کی غیر جمہوری سازش کی گئی تو بھی جمہوری نظام اور ملکی استحکام کو خطرات لاحق ہوں گے۔ اِس مشکل صورتِ حال میں وفاق اور جمہوریت کی حامی قوتوں بشمول پیپلز پارٹی کو کیا لائحہ عمل اختیار کرنا چاہیئے۔ اِس مسئلے پر اگلے مقالے کے دوسرے نصف حصّے میں بحث کی گئی ہے۔

صُوبائی حقُوق اور جمہُوری استحکام — چند پہلو

I

پاکستان کے استحکام کے لیے وفاق اور صوبوں کے درمیان اختیارات کی تقسیم کا معاملہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ہمیشہ کی طرح یہ موضوع آج بھی سیاسی رہنماؤں اور مفکرین کے زیر غور ہے۔ ۱۹۷۳ء کے آئین سے منحرف کچھ حلقوں نے برٹش دور کی آل انڈیا مسلم لیگ کی جانب سے صوبائی حقوق کے مطالبے کے حوالے کچھ اس انداز سے دیئے ہیں جس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ صوبائی خود مختاری کے مؤقف کو مسلم لیگ ہی کے تصور پاکستان کے مقابلے میں پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ بات محل نظر ہے۔ اسی ضمن میں اُن حلقوں کی جانب سے مسلم لیگ کی ۱۹۴۰ء کی قرارداد کا مخصوص انداز سے حوالہ دیا جاتا ہے جس کی تشریح سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ مسلم لیگ کا اصل مقصد پاکستان کو وفاقی ریاست نہیں بلکہ کنفیڈرل ریاست بنانا تھا۔ اسی تسلسل میں بعض حلقوں کی جانب سے پاکستان کے چار صوبوں کو چار عدد آزاد قوموں کے اوطان تصور کرنے کا مطالبہ کرکے ایسے کنفیڈرل نظام کے قیام کا پروگرام پیش کیا گیا ہے جس میں چاروں قوموں کو برابر برابر نمائندگی دی جائے۔ ذیل کی سطور میں ہم مذکورہ تین موضوعات کو زیر بحث لائیں گے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ برٹش دور کی آل انڈیا مسلم لیگ صوبائی خود مختاری کی حامی تھی۔ اُس کا یہ مؤقف اُن معاملات اور مسائل کے حوالے سے سامنے آیا جو اُس وقت مسلمانان ہند کو درپیش تھے۔ غیر منقسم ہندوستان کے حالات سے آگاہ افراد اچھی طرح جانتے ہیں کہ برصغیر میں آزادی سے قبل مسلم رہنماؤں کا سب سے بڑا مسئلہ مسلمانان ہند کے حقوق کا تحفظ تھا۔ غیر منقسم ہندوستان میں ہندو بھاری اکثریت میں تھے۔ وہ زیادہ تعلیم یافتہ تھے۔ تجارت اور سرکاری ملازمتوں پر اُن کا قبضہ تھا۔ مسلمان عام طور پر پسماندہ تھے اور وہ اپنے معاشی، سیاسی اور تہذیبی حقوق کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ ۱۹۴۰ء سے پہلے آل انڈیا مسلم لیگ متحدہ ہندوستان کی ریاست کی قائل تھی اور ایک ہی ریاست کے اندر مسلمانوں کے حقوق کے لیے مناسب آئینی اقدام اور طریق کار تلاش کر رہی تھی۔ اس کا ایک حل اُس نے صوبائی اختیارات میں توسیع میں ڈھونڈا تاکہ مسلم اکثریتی صوبے زیادہ سے زیادہ معاملات میں مرکزی حکومت کی مداخلت سے آزاد رہیں کیونکہ مرکزی حکومت میں ہندوؤں کا غلبہ تھا۔

۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ نے متحدہ ہندوستان میں صوبائی اختیارات میں توسیع کی بجائے برصغیر کی تقسیم کا مطالبہ کر دیا۔ تقسیم ہند کی قرارداد کے بعد مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے جو بھی مسائل اٹھائے گئے اور دلیلیں دی گئیں اُن کا تعلق مسلمانوں کے اجتماعی مفاد سے تھا۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ پاکستان کے قیام کی تحریک، مسلمانوں کی بحیثیت مجموعی خودارادیت کی تحریک تھی جس کا مقصد علیحدہ مُسلم ریاست کا قیام تھا۔ یہ مسلمانوں کے اکثریتی صوبوں کی الگ الگ خود ارادی کی تحریک نہ تھی۔

II

آئینی نظام کے بارے میں بعض حلقوں کی جانب سے نظری نوعیت کا یہ مسئلہ اُٹھایا جا رہا ہے کہ ۱۹۴۰ء کی قرارداد

کی رو سے اِس کا آئینی ڈھانچہ کنفیڈرل بنتا ہے۔ خیال رہے کہ سندھی بلوچ پشتون فرنٹ کی جانب سے پاکستان کے وجود کے جواز کو چیلنج نہیں کیا جا رہا بلکہ صرف ریاست کے آئینی ڈھانچہ کی نوعیت کے بارے میں اختلاف کیا گیا ہے۔

اب ہم ۱۹۴۰ء کی قرارداد سے متعلقہ حصّے کا مختصراً تجزیہ پیش کریں گے۔ اِس قرارداد میں برصغیر کے دو مسلم اکثریتی علاقوں کے لئے زون یا ریجن کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ مشرقی ریجن اب بنگلہ دیش بن گیا ہے اور شمال مغربی ریجن موجودہ پاکستان کی صورت میں موجود ہے۔ اِن دو ریجنوں کے لئے آزاد ریاستوں کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ جہاں تک اِن دو آزاد ریاستوں میں شامل صوبوں کا تعلق ہے اُن کے بارے میں یونٹ کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ اِن یونٹوں یا صوبوں کے لئے بھی "ساورن" اور "آٹانومس" کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ کنفیڈریشن کے دعویدار اپنے مؤقف کی تائید میں یونٹ (صوبوں) کے لئے "ساورن" کی اصطلاح کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ چنانچہ یہ سمجھنے کے لئے کہ اِس قرارداد کی رو سے یونٹ (صوبوں) اور ریجن (آزاد ریاست) کا باہمی تعلق کیا ہوگا ہم ریجن کے اختیارات کا ذکر کریں گے۔ جو قرارداد میں وضع کئے گئے ہیں۔ قرارداد کے متعلقہ اور آخری پیرے کا ترجمہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

> "یہ اجلاس ورکنگ کمیٹی کو مزید اختیار دیتا ہے کہ وہ (مذکورہ) بنیادی اصولوں کی اساس پر آئینی سکیم تیار کرے۔ جس کے مطابق متعلقہ ریجن بالآخر تمام اختیار حاصل کر سکیں۔ مثلاً دفاع، خارجہ معاملات مواصلات، کسٹم اور ایسے دوسرے معاملات جو اہم متصور ہوں"۔

خیال رہے کہ قرارداد میں آئینی ڈھانچہ بنانے کی ذمہ داری ورکنگ کمیٹی کے سپرد کی گئی۔ لیکن افسوس کہ ورکنگ کمیٹی نے یہ ذمہ داری نہیں نبھائی۔ بعد میں اِس معاملے پر مسلم لیگ کے ٹکٹ پر منتخب ہونے والے قانون ساز اداروں کے نمائندوں کے کنونشن منعقدہ اپریل ۱۹۴۶ء میں غور کیا۔ اِس کنونشن میں ایک قرارداد پاس کی گئی جس میں بنگال اور آسام کو ایک زون اور پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ، سندھ اور بلوچستان کو دوسرا زون قرار دے کر اُن دونوں پر مشتمل ایک واحد آزاد ریاست پاکستان کا مطالبہ پیش کیا گیا۔ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کی قرارداد لاہور کا ذکر صرف اقلیتوں کے تحفظ کے ضمن میں آیا جہاں تک ساورنٹی کا تعلق ہے اِس کے بارے میں یہ بات واضح ہو گئی کہ ساورنٹی صرف آزاد ریاست (پاکستان) کے لئے تھی۔

بعض حلقے ۱۹۴۶ء کی کنونشن اور اِس میں منظور شدہ قرارداد کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے۔ اگر ہم بحث کی خاطر یہ تسلیم بھی کر لیں کہ ۱۹۴۶ء کا کنونشن غیر نمائندہ تھا تو بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس مرکزی ریاست کو ۱۹۴۰ء کی قرارداد کی رو سے کسٹم ڈیوٹی وصول کرنے، دفاع اور امورِ خارجہ کے فرائض سرانجام دینے اور مواصلات کا انتظام کرنے کا اختیار حاصل ہو اور مزید برآں "دوسرے معاملات جو اہم متصور ہوں" کے غیر متعین اختیارات کی بھی گنجائش موجود ہو اُس کے مؤثر ڈھانچے اور ساورنٹی کے بارے میں کیا شک و شبہ باقی رہ جاتا ہے۔ تاہم یہ بات صحیح ہے کہ ۱۹۴۰ء کی قرارداد کے مطابق صوبائی حکومتوں کے لئے بے شمار معاملات میں وسیع اختیارات موجود رہتے ہیں۔ افسوس کہ پاکستان میں جمہوری نظام اور صوبائی آٹانومی پر عمل نہ ہو سکا جس کے نتیجے میں مشرقی زون میں علیحدگی کے مواقع پیدا ہوئے۔

اب ہم اِس معاملے پر غور کریں گے کہ مسلم لیگ کا ۱۹۴۶ء کا کنونشن نمائندہ تھا یا نہیں۔ اِس اجلاس میں برٹش انڈیا کی مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے وہ ارکان شامل ہوئے جو آل انڈیا مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کامیاب ہوئے تھے۔ خیال رہے کہ ۱۹۴۶ء کے منعقدہ انتخابات میں مسلم لیگ کے نمائندوں نے برٹش انڈیا کی اسمبلیوں کی مسلم نشستوں پر

٩٠ فیصد کامیابی حاصل کی تھی۔ اِس کنونشن میں مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کے ارکان بھی شامل ہوئے۔ اِس لئے اس کی نمائندہ حیثیت مسلمہ ہے۔ یہ اجلاس ٧ اپریل سے ٩ اپریل ١٩٤٦ء تک تین روز تک ہوتا رہا۔ خیال رہے کہ اِس اجلاس کے دوران میں سبجیکٹ کمیٹی کی میٹنگ قائداعظم کی زیر صدارت ہوئی۔ جس میں پانچ گھنٹے کی بحث کے بعد وہ قرارداد تیار کی گئی جو کنونشن میں منظور ہوئی اور جس کی رو سے ساورنٹی صرف پاکستان کے لئے قرار داد دی گئی۔

یوں معلوم ہوتا ہے کہ کنفیڈریشن کا حامی گروہ برصغیر کے مسلمانوں کی تحریک آزادی سے پوری آگاہی نہیں رکھتا یا وہ دانستہ اپنے مخصوص مقاصد کے لئے تاریخ کو مسخ کرنا چاہتا ہے۔ مسلمانوں کی تحریک آزادی سے آگاہ ہر فرد جانتا ہے کہ برٹش دور کی آل انڈیا مسلم لیگ نے مسلمانوں کے مفاد میں مذکورہ بالا قراردادوں کے علاوہ دوسری تجاویز پر بھی غور کیا جن سے اُن کے انداز فکر کی عکاسی ہوتی ہے۔ مثلاً مسلم لیگ نے ایک مرحلے پر کیبنٹ مشن کا زونل پلان بھی منظور کیا اِس پلان کے مطابق غیر منقسم برصغیر کو تین حصوں میں تقسیم کرنے کی تجویز پیش کی گئی۔ اِس میں دو حصے وہ تھے جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ تیسرے حصے میں غیر مسلم آبادی کی اکثریت تھی۔ اگر اِس پلان پر عمل ہو جاتا تو اِن زونوں میں شامل ہونے والے صوبوں کو ساورنٹی تو کیا حاصل ہوتی آٹانومی بھی بُری طرح سے مجروح ہوتی۔ اِس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ مسلم لیگ کے سامنے بنیادی مسئلہ مسلمانوں کا اجتماعی مفاد تھا نہ کہ صوبوں کے لئے ساورنٹی کا حصول۔

اب تجاویز سے نکل کر حقیقی صورت حال ملاحظہ فرمائیں۔ ہم بخوبی جانتے ہیں کہ جب انگریز رخصت ہوا تو برصغیر کی تقسیم کے لئے آزادی ہند ایکٹ ١٩٤٧ء کی آئینی دستاویز مسلم لیگ سمیت تمام متعلقہ سیاسی طاقتوں نے منظور کی۔ اِس کی رو سے بھارت کی طرح پاکستان کے لئے وفاقی ڈھانچہ تشکیل پذیر ہوا۔ یہی آئینی ڈھانچہ برصغیر کی اُس وقت موجود سیاسی قوتوں کے ذہنی اور سیاسی افکار کی عکاسی کرتا ہے۔

ہم نے مسلم لیگ کی متعلقہ قراردادوں اور تجاویز کا ذکر اِس لئے کیا ہے کہ تاریخی واقعات کو صحیح طور پر سمجھا جا سکے۔ تاہم ہماری رائے میں اِس وقت جو صورت حال موجود ہے وہ اُس سے قطعی مختلف ہے جو برٹش انڈیا کے دور میں برصغیر کے مسلمانوں کو ١٩٤٠ء اور ١٩٤٦ء کے دوران میں درپیش تھی۔ کسی بھی سیاسی معاملے کا حل مروجہ حالات اور مستقبل کے متوقع معاملات سے صرف نظر کر کے ممکن نہیں ہوتا۔ جو قومیں حقیقی صورت حال کو صحیح طور پر سمجھنے اور اُن کا ممکنہ حل دریافت کرنے میں کوتاہی برتتی ہیں وہ اپنے قومی وجود کو لازماً خطرات سے دوچار کرتی ہیں۔ چنانچہ ہماری رائے میں قطع نظر اِس کے کہ قیام پاکستان سے پہلے مسلم لیگ کا تصور وطن کیا تھا ہمیں آج کے معروضی حالات کا بیلاگ جائزہ لینا چاہئیے۔ اور ایسا فیصلہ کرنا چاہیے جس سے مُلک کو استحکام اور ترقی حاصل ہو۔ ہمارے خیال میں قیام پاکستان سے قبل مسلم لیگ نے اِس بات کا تصور تک نہ کیا ہو گا کہ پاکستان میں قومیتوں کا مسئلہ اُٹھ کھڑا ہو گا۔ قائداعظم آئینی اور جمہوری طرز حکومت کے حامی تھے۔ اور وہ یہ تصور تک نہ کر سکتے تھے کہ پاکستان میں معاشی اعتبار سے غیر منصفانہ اور سیاسی اعتبار سے غیر جمہوری معاشرہ پروان چڑھے گا۔ یہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ پاکستان میں مارشل لا کی حکومتیں قائم ہو جائیں گی۔

اِس وقت جو حقیقی صورت حال موجود ہے اُس نے پاکستان کے اوریجنل تصور کی بحث کو عملی زندگی میں اِتنا متعلقہ نہیں رہنے دیا۔ یہ بحث ہم نے صرف اِس لئے کی ہے کہ بعض حلقوں کی جانب سے مسلم لیگ کی تحریک کو غلط رنگ میں پیش کرانے کی کوشش کی گئی جس کی وضاحت ضروری تھی۔

III

بعض اوقات ہمیں شبہ ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں کنفیڈریشن کے مفہوم کا صحیح ادراک نہیں پایا جاتا۔ کنفیڈریشن آزاد ریاستوں کے درمیان ایک معاہدے کی شکل ہوتی ہے۔ جس میں آزاد ریاستیں اپنی رضا سے ایک بالاتر ریاستی ڈھانچہ قائم کرلیتی ہیں۔ جسے وہ کچھ اختیارات منتقل کر دیتی ہیں۔ تاہم انہیں کنفیڈریشن سے دوبارہ علیحدہ ہوجانے کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔ کنفیڈریشن کے آئینی مفہوم کو اس کے بہت سے دعویدار اپنی نظر سے اوجھل کر دیتے ہیں۔ مثلاً پروفیسر غلام مصطفیٰ شاہ نے متعدد بار مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے مابین اختیارات کی پسندیدہ تقسیم کی مثال امریکی اور بھارتی آئینی ڈھانچہ بیان کی۔ جبکہ آئینی ماہرین جانتے ہیں کہ مذکورہ دونوں ریاستیں فیڈرل طرز کی ہیں۔ اور بالخصوص بھارت کے آئین میں صوبوں کو جو اختیار دیئے گئے ہیں وہ ہمارے ۱۹۷۳ء کے آئین سے کم ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ بھارت میں آئین پر عملدرآمد ہوتا ہے۔ اور ہمارے ہاں آئین پر عمل نہیں ہوسکا۔

کنفیڈریشن کے نظریئے کے رہنما جناب ممتاز بھٹو نے ۲۴ فروری ۱۹۸۶ء کو لاڑکانہ بار سے خطاب کرتے ہوئے کنفیڈریشن کی مثالیں پیش کرتے ہوئے یوگوسلاویہ اور سوویت یونین کا حوالہ دیا۔ (بحوالہ ڈان ۲۵ فروری ۱۹۸۶ء) یہ حوالہ بے محل ہے۔ یہ ممالک بالکل مختلف سوسائٹیاں ہیں۔ جہاں صرف ایک سیاسی جماعت کا وجود ہے اور قومیت یا مخصوص علاقے کی بنیاد پر کسی دوسری سیاسی جماعت کے وجود کی قانونی اجازت نہیں اس لئے وہاں عملی زندگی میں علیحدگی کا امکان سرے سے مفقود ہے۔ چونکہ ہمارے مُلک میں متعدد سیاسی جماعتوں کا حامل نظام موجود ہے۔ اس لئے یہاں ان دو ممالک کے آئینی نظاموں سے تقابل ممکن نہیں۔ کنفیڈریشن کے دعویداروں کی جانب سے اس تاریخی حقیقت سے بھی اغماض برتا جاتا ہے کہ تاریخ میں عام طور پر جتنی کنفیڈریشنیں قائم ہوئیں وہ یا تو ٹوٹ گئیں یا فیڈریشن میں منتقل ہوگئیں۔ تیسری دنیا میں سوائے غیر نمائندہ نظام حکومت کی حامل متحدہ عرب امارات کے اس نظام کا تجربہ کامیاب نہیں رہا۔

سندھی بلوچ پشتون فرنٹ کی کنفیڈریشن کی تجویز اس نظریئے پر قائم کی گئی ہے کہ پاکستان چار قوموں پر مشتمل ہے جو موجودہ چار صوبوں میں بستی ہیں۔ گویا اس تجویز میں یہ تصور کرلیا گیا ہے کہ ہر صوبے کی آبادی ایک مسلمہ قوم ہے خیال رہے کہ سندھی بولنے والے سیاسی دانشور اور رہنما تسلیم کرتے ہیں کہ سندھ میں آباد کم از کم اردو بولنے والی آبادی سندھی ہے۔ لیکن علم سیاست کی قومیت کی تعریف کے مطابق جسے سندھی حلقے قبول کرتے ہیں دوسرے صوبوں کی صورتِ حال مختلف ہے۔ وہ مسلمہ طور پر ایک سے زیادہ قومیتوں پر مشتمل ہیں کیونکہ وہاں آباد لسانی اور تہذیبی گروہ ہجرت کرکے نہیں آئے بلکہ اپنے اپنے علاقوں کے مستقل باشندے ہیں۔ چنانچہ کنفیڈریشن کی تجویز چار قومیتوں کے غلط تصور پر قائم اور کئی اعتبار سے بے سروپا ہے۔ تاہم فرنٹ نے مرکزی حکومت کے لئے چار سبجیکٹ متعین کئے ہیں یعنی دفاع، امورِ خارجہ، مواصلات اور کرنسی۔ فرنٹ نے اپنی تجاویز میں مرکزی حکومت کی جانب سے ٹیکس عائد کرنے کی بھی کچھ گنجائش رکھی ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو فرنٹ مرکزی حکومت کو بے اثر نہیں بنانا چاہتا۔ مگر اس کی تجاویز میں یہ بات محل نظر ہے کہ مجوزہ کنفیڈریشن کی چار اکائیوں کے لئے اُن کی آبادی سے قطع نظر مرکزی اسمبلی اور دوسرے اداروں میں برابر برابر نمائندگی ہونی چاہیئے۔ اسے پیریٹی کا نام دیا گیا ہے۔

پیریٹی کے مطالبے کی تہہ میں بھی یہی تصور کارفرما ہے کہ پاکستان میں چار "قومیں" یا کم از کم "قومیتیں" رہتی ہیں۔

جو پنجاب ، سندھ ، سرحد اور بلوچستان میں آباد ہیں ۔ گویا قومیتوں کا وجود مقررہ وقت میں متعین صوبوں کی بنیاد پر قائم کیا گیا ہے ۔ حالانکہ متعین علاقے میں آباد ایک ایسے تہذیبی گروہ کو قومیت قرار دیا جاسکتا ہے جس کی کوئی تاریخ اور روایات ہوں ۔ مثلاً ہم دیکھ رہے ہیں کہ پنجاب کے ایک علاقے میں سرائیکی زبان اور تہذیب کی بنیاد پر ایک سوچ اُبھر رہی ہے اور سرائیکی کے ادیب ، شاعر اور کچھ دانشور اِس نئی سوچ کو فکری اعتبار سے منظم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں ۔ میرا مشاہدہ ہے کہ اِس تحریک کی سندھ میں تائید موجود ہے ۔ سندھی اور سرائیکی زبانوں کا عرصہ دراز سے گہرا تعلق رہا ہے ۔ سندھ کا وہ علاقہ جو بہاولپور ڈویژن کے ساتھ ہے وہاں متعدد بلوچ قبائل کی مادری زبان سرائیکی ہے ، اگرچہ وہ اپنے تاریخی اور سیاسی تعلق سے سندھی ہیں ۔

یہاں میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ اگر تہذیب ، روایات ، تاریخ اور علاقے کی بنیاد پر ہر قومیت کے لئے علیحدہ صوبہ قائم کرنے کا اصول تسلیم کر لیا جائے تو پھر پاکستان کا موجودہ چار صوبوں تک محدود رہنا مشکل نظر آتا ہے ۔ مثلاً جناب خورشید حسن میر کی عوامی جمہوری پارٹی پنجاب میں سرائیکی کے علاوہ پوٹھوار کا علیحدہ صوبہ قائم کرنے کی بھی داعی ہے ۔ اُن کی پارٹی کے ایک رہنما کے خیال میں موجودہ صوبہ بلوچستان کی بلوچ اور پختون علاقوں میں تقسیم بھی بالکل جائز ہے ۔ خیال رہے کہ جناب غوث بخش بزنجو سرائیکی صوبے کے قیام کے حامی ہیں ۔ اب سرائیکی علاقے بلوچستان اور صوبہ سرحد میں بھی واقع ہیں ۔ اگر معاملہ یہاں تک جا پہنچے تو یہ امکان بھی ہو سکتا ہے کہ کراچی میں بسنے والے کچھ لوگ کراچی کے لئے علیحدہ صوبے کا مطالبہ شروع کر دیں ۔ حالانکہ تاریخ اور روایات کے اعتبار سے کراچی کی علیحدہ قومیت کا کوئی جواز نہیں بنتا اور یہ بات سندھی بولنے والی آبادی کے لئے بھی قابلِ قبول نہیں ۔ مگر مسئلہ تو غلط تاویل بھی کھڑا کر سکتی ہے ۔ تاہم اِس میں شک نہیں کہ پیریٹی کی بحث قومیتوں کے حوالے سے پھیل کر تمام صوبوں میں ایسی صورت اختیار کر سکتی ہے جس میں اُن کی تقسیم در تقسیم کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہو گا اور اِس طرح متعدد لسانی گروہوں کے درمیان باہم متصادم مطالبات سامنے آجائیں گے ۔ یہ صورت حال امن و امان کا شدید مسئلہ پیدا کر دے گی ۔

۱۱

تاریخ عالم گواہ ہے کہ جو ریاست بہت سی قومیتوں پر مشتمل ہو وہاں تہذیبی ، سیاسی اور معاشی معاملات میں باہمی کشمکش رنجشیں موجود ہوتی ہیں ۔ مگر جن ممالک میں جمہوری نظام حکومت قائم ہو وہاں یہ شکایات موجود رہنے کے باوجود حد سے آگے نہیں بڑھتیں اور جوں جوں باہمی معاشی اور دوسرے مشترک مفادات فروغ پاتے ہیں ، وہاں یکجہتی کو فروغ ملتا ہے ۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے ملک میں آئین کا احترام نہیں ہوا اور اِس طرح جمہوری نظام تہہ و بالا ہوتا رہا ۔ فوجی حکمرانوں نے جب بھی اپنی دانست میں مناسب سمجھا آئین منسوخ یا معطل کر کے ملک کے اقتدارِ اعلیٰ پر قبضہ کر لیا ۔ ہم نے یہ بھی دیکھا کہ سول انتظامی مشینری آمرانہ طرزِ حکومت کی کامیابی اور استحکام کا ذریعہ بن گئی ۔ اِن حالات میں بعض لسانی گروہوں میں جنہیں ریاستی اقتدار میں حصہ نہیں ملا ، محرومیوں کا احساس اُبھرا ۔ اِس طرح اُن گروہوں کے باشعور اور سیاسی حلقوں میں مرکز گریز رجحانات پیدا ہوئے ۔ فی الواقع اِسی بنا پر کچھ سیاسی رہنماؤں نے کنفیڈریشن کا نظریہ پیش کیا ۔ اِس نظریئے کا بڑا جواز ہی یہ پیش کیا گیا کہ ۱۹۷۳ء کے آئین کے تحت قائم شدہ فیڈرل جمہوری نظام خود کو فوج کی دست برد سے نہیں بچا سکا ۔ چنانچہ اُنہوں نے مطالبہ کیا کہ فوج کی سیاسی قوت کو توڑنے کے لئے فیڈرل نظام کی بجائے کنفیڈریشن کا نظام رائج کیا جائے مگر اِس شرط کے ساتھ کہ اگر فوج اُس صورت میں بھی برسرِ اقتدار آجائے تو کنفیڈریشن

بھی ختم ہو جائے گی۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا کسی بھی ترقی پذیر ملک میں جہاں نمائندہ حکومت قائم ہوئی وہاں کنفیڈریشن کا تجربہ کامیاب نہیں ہو سکا۔ چنانچہ ایسی قوتیں جو پاکستان کے موجودہ ریاستی وجود کو کسی خطرے سے دوچار نہیں کرنا چاہتیں وہ فیڈریشن ہی کے نظام میں جمہوری استحکام پیدا کرنا چاہتی ہیں۔ ہمارے نزدیک اصل ضرورت ایک ایسے جمہوری نظام کی ہے جس میں سب علاقوں اور قومیتوں کو اقتدار میں حصہ ملے۔ اور اس طرح ایک ایسا جمہوری استحکام پیدا ہو جائے جس کے بعد مارشل لاء کے نفاذ کی گنجائش باقی نہ رہے۔ مگر جیسا کہ ہمیں معلوم ہے جمہوری نظام ترقی پذیر صنعتی معیشت کی بنیاد پر پروان چڑھتا ہے۔ قوم پرست صنعتکار طبقہ ہی ایسی معیشت اور جمہوری نظام کے فروغ میں کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔ افسوس کہ ہماری حکومتوں اور بڑے صنعتکاروں نے قومی خود انحصاری کا رویہ نہیں اپنایا بلکہ اس کے برعکس استعماری ملکوں پر انحصار قائم رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں جمہوری نظام کے قیام کی کاوشوں کو موزوں معاشی ڈھانچہ اور طبقاتی تائید میسر نہیں ہوئی۔ جمہوری نظام کے قیام کی جدوجہد کا ایک بنیادی تقاضہ یہ بھی ہے کہ خود انحصاری کے اصول پر قائم صنعتی پالیسی اختیار کی جائے۔ ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا چاہیئے کہ جمہوری استحکام صرف انتخابات ہی سے نہیں بلکہ اُس کے ساتھ ہی جمہوری رویہ اور قدروں کی پاسداری سے آتا ہے۔ ہم نے غلطی سے جمہوری نظام کو صرف آئینی معاملہ قرار دے کر اعلیٰ عدالتوں سے توقع وابستہ کئے رکھی۔ کہ وہ آئین کی پاسداری کا فریضہ ادا کریں گی۔ اگر غور سے سوچا جائے تو جمہوریت اور آئین کا تحفظ رائے عامہ کیا کرتی ہے۔ اگر رائے عامہ منظم نہ ہو تو فوج کو سیاست میں ملوث ہونے سے کوئی بھی آئین اور کوئی بھی عدالت نہیں روک سکتی۔

لہٰذا ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ جمہوری نظام کی طرز اور ہیئت کیسی ہو تا کہ جمہوری استحکام کے حصول میں آسانی ہو، جمہوری شعور اُبھرے، عوام اور حکومتی مشینری میں جو دُوری اور بے اعتمادی پائی جاتی ہے وہ ختم ہو جائے اور سرکاری اہلکار حکمران بننے کی بجائے حقیقی معنوں میں پبلک سرونٹ بن جائیں۔ یہ سب ایک ایسے نظام میں ممکن ہے جس کی پہلی شرط یہ ہوگی کہ ریاستی طاقت کو وفاق اور صوبوں کے ایک یا دو مراکز میں مرتکز کرنے کی بجائے حتی الامکان ضلع اور نچلی سطحوں میں پھیلا دیا جائے۔ دوسری شرط یہ کہ ریاستی طاقت کی ہر سطح عوام کی منتخب کردہ ہو اور انتظامیہ کے کلیدی عملے کے تقرر کا اختیار نمائندہ حکمرانوں کو ہو۔ تیسری یہ کہ پبلک سرونٹ عوام کے منتخب نمائندوں کے فیصلوں کے پابند اور اُن کے سامنے جواب دہ ہوں۔ متذکرہ بالا نظام کے تحت ریاستی طاقت، فوج اور بیوروکریسی کے طبقہ سے نکل کر عوام کے منتخب نمائندوں کے ہاتھ میں آجائے گی جو عوام کے سامنے جواب دہ ہوں گے اور جن کا محاسبہ انتخابی عمل کے ذریعے ہوتا رہے گا۔

ہمارے ہاں اس وقت جو انتظامی ڈھانچہ موجود ہے وہ انگریز حکمرانوں نے ہمیں غلام بنائے رکھنے کے مقصد سے اختیارات کے ارتکاز کے اصول پر قائم کیا تھا۔ بڑے سول افسران کا تقرر پبلک سروس کمیشن کرتا ہے جو خود بڑے افسروں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ان افسران کی ایک مضبوط برادری بن چکی ہے جو اپنے اختیارات کو مستقلاً توسیع اور تحفظ دیتی رہتی ہے۔ حتیٰ کہ مرکز کے وزراء بھی خود کو اُن کے سامنے بے بس پاتے ہیں۔ صوبوں کے اعلیٰ حکام بھی اسی برادری میں سے مقرر ہوتے ہیں۔ اُن کی تقرری، تبدیلی اور ترقی برادری ہی کے اعلیٰ افسران اسلام آباد میں بیٹھ کر طے کرتے ہیں۔ قانونی ضابطے بنانے اور اُن کو نافذ کرنے، ٹیکس عائد کرنے اور وصول کرنے، معیشت کے اصول طے

کرنے اور اُسے کنٹرول کرنے کے سب اختیارات قانونی طور پر اِسی برادری کے قبضے میں ہیں۔ لہٰذا ایک ایسے نظام کی موجودگی میں آئین میں مندرجہ وفاقی اور صوبوں کے درمیان اختیارات کی تقسیم بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ صوبائی وزرا غیر مؤثر ہو جاتے ہیں۔ بیچارے لوکل گورنمنٹ کے منتخب عہدہ دار بے اختیار بن جاتے ہیں کیونکہ اُن کے فیصلے سرکاری افسر معطل کر سکتے ہیں۔ لوکل گورنمنٹ کے ادارے چلانے کے لئے سرکاری افسر مقرر کئے جاتے ہیں جن کی کارکردگی پر نظر رکھنے کا اختیار منتخب نمائندوں کو حاصل نہیں ہوتا۔ اعلیٰ افسران کی برادری کا طبقاتی تعلق اور مفاد بڑے زمینداروں، تاجروں اور اُن غیر ملکی ساہوکاروں اور اداروں سے وابستہ ہو جاتا ہے۔ جن کے ساتھ اُن کا سرکاری معاملات میں واسطہ پڑتا ہے۔ اِس سارے ڈھانچے کی مزید دو خصوصیات یہ ہیں کہ ترقی کا تمام عمل ایسے علاقوں اور ایسے شعبوں میں واقع ہوتا ہے جو حکمران طبقے کے لئے مفید ہوتے ہیں۔ مثلاً جن علاقوں میں اُن کی رہائش ہوگی وہاں عمدہ شہری سہولتیں مہیا کر دی جاتی ہیں۔ بہترین سڑکیں، ہسپتال، تھیٹر، بڑی بڑی رہائشی کالونیاں، ہوٹل، سیر گاہیں، سکول اور کالج قائم ہو جاتے ہیں۔ جو پسماندہ علاقوں کے پڑھے لکھے اور متوسط طبقے کے احساس محرومی میں اضافہ کا باعث بنتے ہیں۔ یہ فطری بات ہے۔ اِس نظام کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ جب کبھی کوئی سول یا فوجی حکمران آمرانہ اقدام کرنے کا فیصلہ کرتا ہے تو وفاقی حکومت کے چند سیکرٹریوں کے ذریعے برادری کے نچلے اور دور دراز علاقوں تک بڑی آسانی سے اُس کی تکمیل ہو جاتی ہے۔

آمریت کا قیام اور اُس کا استحکام ایک ایسا معاملہ ہے جو قومی یکجہتی کے لئے خطرہ بن چکا ہے۔ چنانچہ حُب الوطنی کے جذبات کی پرورش کے لئے لازم ہے کہ اختیارات کا ارتکاز پیدا کرنے والا ڈھانچہ بدل دیا جائے۔ قانون سازی، انتظامیہ اور عدلیہ کے اقتدار کا زیادہ سے زیادہ حصہ مرکز سے صوبوں کو، صوبوں سے ضلعوں کو، ضلعوں سے شہروں تعلقوں تحصیلوں اور اُس سے بھی نیچے قصبوں، یونین کونسلوں اور دیہات کو منتقل کیا جائے۔ دوم پاکستان کے سب قوانین میں جس جس جگہ انتظامی اختیارات افسر شاہی کے پُرزوں یعنی مجسٹریٹ مال افسر، ڈپٹی کمشنر، ڈویژنل کمشنر سیکرٹری وغیرہ کو سونپے گئے ہیں۔ اُن کی جگہ منتخب ادارے، کمیٹیاں یا ان کے نمائندے مقرر کئے جائیں۔ پولیس کو ہر سطح پر مقامی منتخب اداروں کے ماتحت کر دیا جائے۔ مثلاً پولیس شہروں اور قصبوں کے میئر یا کمیٹی کے چیئرمین کے ماتحت ہونی چاہیئے۔ سوم معاشی منصوبہ سازی کے اداروں کو اِس طرح منظم کیا جائے کہ علاقائی ضروریات کے مطابق متعلقہ صوبے اور اضلاع مشترک مفاد کی سکیمیں خود بنا سکیں اور تکمیل کر سکیں۔

موجودہ انتظامی ڈھانچہ (جو آمریت کے لئے بڑا موزوں ہے) کو بدل کر اُس کی جگہ اختیارات کے ارتکاز کو توڑنے والا جمہوری ڈھانچہ قائم کرنا بڑی مشکل بات ہے۔ یہ امر بالکل واضح ہے کہ کوئی غیر مقبول حکمران جماعت یہ کام سرانجام نہیں دے سکے گی۔ اِس لئے کہ اُسے اپنے اقتدار کو مستحکم بنانے کے لئے ایسے ہی انتظامی ڈھانچے کی ضرورت ہے جو اختیارات کے ارتکاز کی بنیاد پر قائم ہو۔ لیکن اگر حکمران جماعت غیر مقبول نہ ہو تو بھی امکان یہی ہے کہ وہ اپنے عارضی مفادات کے پیشِ نظر موجودہ انتظامی ڈھانچے کو برقرار رکھے گی۔ اِس کے برعکس حُب الوطنی اور جمہوریت نوازی کا تقاضا ہے کہ موجودہ نظام کو جمہوریت کے فروغ کے تقاضے پورے کرنے کے لئے مذکورہ بالا منصوبے کے مطابق تبدیل کیا جائے۔ یہ نظام متعدد جمہوری ممالک میں رائج ہے۔ ہماری دانست میں یہ کٹھن کام کوئی ایک سیاسی جماعت سرانجام نہیں دے سکتی چاہے اُسے وفاقی پارلیمان میں عددی اکثریت بھی حاصل ہو کیونکہ پارلیمان میں اکثریت اتنی بھرپور سماجی قوت نہیں بخشتی کہ تنہا ایک جماعت ریاستی طاقت کے موجودہ اداروں کو چیلنج کرنے کی ہمت یا حماقت

کر سکے ۔ سیاست دان اگر فراست اور بردباری سے کام لیں تو اُن کا مشترک مفاد یہی ہے کہ وہ ریاستی طاقت بیوروکریسی کے ہاتھ سے جمہور کے نمائندوں کے دائرے میں منتقل کرنے کے مقصد سے باہمی لائحہ عمل اختیار کریں ۔ اُن کا انفرادی مفاد بھی یہی تقاضا کرتا ہے کہ ریاستی طاقت عوامی نمائندوں کے پاس منتقل کرنے کے لئے عارضی اشتراک کرلیں تاکہ جب بھی وہ حکومت کی مسند پر بیٹھیں اپنے پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہوں ۔ کاش باہم متحارب سیاسی جماعتیں سمجھ سکیں کہ ایسا اشتراک ہوتا ہی سیاسی حریفوں کے مابین ہے جو محدود مشترک مقصد کے حصول کے بعد اختلاف کرنے کے لئے آزاد ہوتی ہیں ۔

مذکورہ بالا تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے آئین اور متعلقہ قوانین میں تبدیلیاں کرنی ہوں گی ۔ کئی نئے قوانین بنانے پڑیں گے ۔ ظاہر ہے کہ اِس معاملہ میں نئے ڈھانچے ، صوبائی حقوق اور جمہوری اقدار کے تحفظ کے لئے بااختیار اعلیٰ عدالتوں کا وجود اور کردار بڑا اہم ہوگا ۔ اختیارات کے ارتکاز کو توڑ کر جمہوری طرز پر انتظامیہ کی نئی تدوین کا پروگرام یقیناً عوام کو شرکت کا احساس دے گا ۔ اُن میں جمہوری شعور پیدا ہوگا اور آمریت کے نفاذ کی راہیں مشکل ہوجائیں گی ۔ مزید یہ کہ اِس سے وفاق اور صوبوں کے مابین شکر رنجی کے اسباب دور ہوجائیں گے اور قومی یکجہتی کو فروغ حاصل ہوگا ۔

ضمیمہ جات

پلیجو لاہور میں ۔

(مندرجہ ذیل سطور کو مضمون بعنوان "سندھ کے ابھرتے فکری رجحانات" میں اضافہ تصور کیا جائے ۔ اِس سے پلیجو صاحب اور اُن کی جماعت کا نقطۂ نظر زیادہ وضاحت سے سامنے آتا ہے) ۔

زیرِ نظر تصنیف کی کتابت ابھی جاری تھی کہ ۴ جولائی ۱۹۸۶ء کو عوامی تحریک کے رہنما اور سندھ کے سوشلسٹ دانشور جناب رسول بخش پلیجو سیاسی اسیران رہائی کمیٹی کے عہدیداروں ملک محمد قاسم اور سید افضل حیدر کی دعوت پر لاہور کے دس روزہ دورے پر تشریف لائے ۔ اِس موقع پر دیہی سندھ کے ایک معروف عوامی رہنما کا ایم آر ڈی کے رہنماؤں کے علاوہ پنجاب کے دانشوروں، جمہوریت پسند کارکنوں، طالب علم اور مزدور رہنماؤں، سیکولر اور سوشلسٹ فکر کے افراد سے غالباً پہلا براہ راست رابطہ اور طویل مکالمہ ہوا ۔ اہل لاہور کے مذکور حلقوں نے جناب پلیجو کا والہانہ استقبال کیا ۔ اُن کے اعزاز میں ہر روز دو دو تین تین استقبالئے منعقد ہوئے ۔ جناب پلیجو نے بڑی صاف گوئی اور بیباکی سے کھلے عام روائتی نظریات، ثقافت، تاریخ اور سیاسی مسائل پر اظہار خیال کیا ۔ محمد بن قاسم، علامہ اقبال اور قائد اعظم محمد علی جناح سے متعلق ہمارے عمومی رویہ کے بارے میں روزنامہ جنگ لاہور کی ۷ اگست کی اشاعت میں اُن سے منسوب ایک خبر شائع ہوئی جس کا متعدد سیاسی اور مذہبی حلقوں میں شدید ردعمل ہوا ۔ پروفیسر وارث میر کے مطابق "اُن کی گفتگو کا علمی معیار ہمارے اکثر سیاسی لیڈروں اور دانشوروں کے مقابلے میں بہت بلند ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اخبار نویسوں کے لئے اُن کے استدلال کو درست اور وسیع تر تناظر میں سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے"۔

اپنے انداز فکر میں وہ بغیر تحقیق اور تصدیق کے کسی شخص یا کسی نظریے پر آمنا و صدقنا کہنے کے قائل نہیں ۔ اُنہوں نے پنجاب کے اہل الرائے سے بھی یہی استدعا کی کہ اُنہیں خود تحقیق اور جستجو کر کے حقیقت معلوم کرنی چاہیئے ۔ اور اُسی کی روشنی میں اپنا لائحہ عمل متعین کرنا چاہیئے ۔ اُنہوں نے کہا جو تاریخ اور نظریہ آپ جانتے ہیں ضروری نہیں کہ وہ سچ یا مکمل ہو ۔ جستجو کر کے دیکھئے، ہو سکتا ہے سچی تاریخ اور نظریہ وہ ہو جو آپ نہیں جانتے ۔ ساری قباحت ملوکیت کی تاریخ کو دین کا درجہ دینے سے پیدا ہوئی ہے ۔ آپ نے سیاسی کارکنوں کو نصیحت کی کہ وہ ثقافت اور جدید سماجی سائنس کی ترقی پسند فکری اساس پر اپنی سیاست استوار کریں ۔

جناب پلیجو ثقافت اور سماجی سائنس کے امتزاج کے تصور کے علمبردار ہیں ۔ البتہ اُن کے نزدیک ہماری ثقافت میں جو چیزیں کام کی نہیں رہیں اُنہیں نکال دینا چاہیئے ۔ اُن کی جگہ بہتر چیزیں جو جدید سائنس نے پیش کی ہیں شامل کر دینی چاہئیں ۔ آج کا نظریہ سائنسی نظریے کا مرہون منت ہے ۔ تاہم آپ وجدان کو بھی برحق تصور کرتے ہیں" وجدان کے ذریعے بھی بہت

بڑے کمالات کی باتیں ہوتی ہیں۔ جب وجدان آگے بڑھتا ہے اور وجدان کے ساتھ ساتھ جب سائنس مل جاتی ہے تو وہ آئنسٹے بن جاتا ہے" انہوں نے کہا تاہم کچھ لوگوں نے وجدان کو سائنس کا متبادل بنا دیا ہے۔ جو صحیح نہیں" سائنسی طور پر جو فکر ہے ـــــ عوامی جمہوری نئی سائنسی فکر ـــــ اُس کی فتوحات، اُس کے ثمرات کو بھی (وجدان کے علم میں) شامل کریں۔ یہ ہماری فکری اساس ہوگی"۔

لاہور کے جن حلقوں سے انہوں نے خطاب کیا وہاں انہیں بغور سنا گیا۔ متعدد حلقوں نے عام طور پر انہیں سراہا اور مخاطبین کے کسی حلقے نے اُن کے اِس نقطۂ نظر سے اختلاف نہیں کیا کہ ہر صوبے کے وسائل (جو قیام پاکستان کے وقت موجود تھے) اور ملازمتوں کے مواقع پر اُس صوبے کے عوام کا مکمل اور قطعی حق ہے۔ ہر خطاب کے دوران وہ اِس "بنیادی اصول" کا اعادہ کرتے رہے۔ خیال رہے کہ یہ اصول صرف پلیجو یا اُن کی جماعت کا پیش کردہ نہیں ہے۔ البتہ جناب پلیجو کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے پنجاب کے دل میں آکر بیباکی سے یہ اصول بیان کرنے میں پہل کی۔ راقم کی رائے میں باہمی سیاسی اور نظریاتی اختلاف کے باوجود تمام تر سندھی اور اُردو بولنے والی آبادی کی بھاری تعداد اِس اصول پر یک زبان اور متحد ہے۔ تاہم جناب پلیجو نے معاشی ترقی کے ثمرات سے پاکستان کے تمام شہریوں کے لئے استفادہ اور معاونت کے امکان کو تسلیم کیا۔ جناب پلیجو نے راقم کے ساتھ ۱۲ جولائی ۱۹۸۶ء کو ایک خصوصی انٹرویو میں فرمایا کہ قیام پاکستان کے وقت صوبوں کے وسائل ہر صوبے کا اپنا اپنا کیپٹل ہے۔ اس کیپٹل پر کسی کو دست درازی نہیں کرنی چاہیئے۔ پاکستان بننے کے بعد "جو نئی معیشت پیدا ہوگی، جو نئے فوائد ہوں گے، جو اور چیزیں ملیں گی، جو اور پھول کھلیں گے، جو ثقافت بڑھے گی، تمدن بڑھے گا، تہذیب بڑھے گی، ہماری ملکیت، دولت، مواقع انٹرنیشنل لیول پر جو ہمارے ہوں گے" یہ سب پاکستانیوں کیلئے مشترک ہیں۔

جناب پلیجو نے بڑے افسوس سے کہا کہ چھوٹی قومیتوں کے معاملات، اُن کے مسائل اور اُن کی ثقافت کے بارے میں پنجابی اور اُردو بولنے والے بعض حلقوں میں تضحیک کا رویہ پایا جاتا ہے۔ قوم کو کل جسم سے تشبیہ دیتے ہوئے اُنہوں نے کہا کہ اگر جسم کے کسی ایک حصے کو تکلیف ہو تو ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ آدمی صحت مند ہے اور صرف گردہ یا پھیپھڑا یا آنکھ بیمار ہے۔ علاقائی مسئلے پاکستان کے کل مسائل کا حصہ ہیں۔ اور اُن کی طرف توجہ کرنا فی الواقع قومی مسائل سے منہ موڑنے کے مترادف ہے۔ سماجی اور معاشی نظام کے بارے میں اپنے تصور کو واضح کرتے ہوئے اُنہوں نے فرمایا کہ وہ کسی پرولتاری یا سوشلسٹ نظام کے قیام کے لئے جدوجہد نہیں کرتے۔ سردست وہ قومی جمہوری نظام کے قیام کے علمبردار ہیں۔ مگر اصطلاحی بحث میں اُلجھنے کی بجائے وہ اسے ترقی پسند جمہوری نظام کہنا بہتر خیال کرتے ہیں، جو آمریت اور استحصالی ممالک کے اثر سے آزاد ہو۔ جہاں طبقاتی اور قومیتوں کی سطح پر انصاف ہو۔ جناب پلیجو اگرچہ جاگیرداری جلد از جلد ختم کرنا چاہتے ہیں تاہم اگر سلسلہ وار اقدامات ہی ممکن ہوں تو وہ جذباتی انقلابیت سے پرہیز کریں گے۔ اُن کے تصور معیشت میں نیشنلسٹ سرمایہ کاروں کا اہم مقام ہے۔ آج کے پاکستان میں اہم مرحلہ جمہوری نظام قائم کرنے کا ہے۔ ۱۹۷۳ء کے آئین کے بارے میں انہوں نے کہا کہ یہ ایک ایسی دستاویز ہے جسے آئینی طور پر ہی رد کیا جا سکتا ہے۔ آئین کی خلاف ورزی سے اُس کی قانونی حیثیت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔

مسٹر پلیجو نے کہا کہ پنجاب کے کچھ جمہوریت پسند راہنماؤں اور کارکنوں سے اُن کا رابطہ پنجاب کی جیلوں میں قید کے دوران میں قائم ہوا۔ جہاں اُن کی ملاقات ساتھی قیدی وکلاء، طلباء اور مزدور کارکنوں سے بھی ہوئی۔ اُس وقت اُنہیں پورا

اندازہ ہوا کہ جمہوری آزادیوں اور بنیادی حقوق سے پنجاب بھی محروم ہے۔ پنجاب کے عوام بھی اُسی درد میں مبتلا ہیں جس طرح دوسرے صوبوں کے رہنے والے۔ اِس طرح درد میں شریک لوگوں میں ایک باہمی تعلق قائم ہوا۔ حالیہ دورے کے دوران اُنہیں یقین ہو گیا ہے۔ کہ پنجاب دو ہیں۔ ایک پنجاب جاگ رہا ہے جو جبر اور ظلم کے خلاف ہے۔ وہ عوام کے حقوق اور انصاف کے لئے جدوجہد کر رہا ہے۔ یہ پنجاب ثقافتی طور پر بھی بیدار ہو رہا ہے۔ یہ بُلھے شاہ کا پنجاب ہے۔ دوسرا پنجاب ملکی سالمیت کے نام پر آمروں کا ساتھی ہے اور اسلام کی نظری بحثوں کے نام پر دوسری قومیتوں کے حقوق کو غصب کرنے کی راہ ہموار کرتا ہے۔ اوّل الذکر پنجاب کے بارے میں راقم سے گفتگو کرتے ہوئے اُنہوں نے فرمایا "میں نے پنجاب کو بہت پیار اپنایا پایا۔ وہ جو دوسرے والا پنجاب ہے وہ تو سندھ میں بھی ہے۔ سندھ میں بھی جبر ہے، ظلم ہے، رجعت پسند فلسفہ ہے"۔ "اپنے والے" پنجاب کے بارے میں وہ پُر یقین تھے۔ کہ یہ پنجاب اپنے لئے اور دوسرے صوبوں کے لئے جمہوری حقوق اور انصاف کا صدق دل سے خواہاں ہے۔ تاہم اُنہوں نے مطالبہ کیا کہ اُسے فکری اعتبار سے اور آگے بڑھنا چاہیئے۔

قومیتوں کا مسئلہ جو کچھ عرصہ سے زیر بحث ہے، اُس کے بارے میں میں نے جناب پلیجو صاحب سے اِس خدشہ کا اظہار کیا کہ یہ مسئلہ متعدد مزید صوبوں کے قیام کے مطالبے کی وجہ سے تشویشناک صورت حال پیدا کر سکتا ہے۔ بالخصوص جبکہ علاقوں کے بارے میں اُن کے مطالبات میں اختلاف موجود ہے۔ آپ نے اِس سوال کا جواب دینے سے احتراز کیا۔ اِس ضمن میں راقم نے جناب پلیجو کے سامنے "کمیٹی برائے جمہوریت" کی یہ تجویز پیش کی کہ ریاستی طاقت کو حتی الامکان ضلعی اور جس حد تک ممکن ہو نچلی سطح تک پھیلا دیا جائے۔ اور اُسے سرکاری حکام کی بجائے عوام کے منتخب نمائندوں کے ہاتھوں میں منتقل کر دیا جائے۔ میں نے یہ بھی تجویز پیش کی کہ معاشی منصوبہ ساز اداروں کے ارتکاز کو بھی حتی الامکان ختم کیا جائے۔ یکساں وسائل اور مسائل کے حامل اضلاع کی بنیاد پر نئے منصوبہ ساز ادارے قائم کئے جائیں۔ صوبائی اور وفاقی منصوبہ ساز ادارے اُن کو فنی مہارت اور مدد مہیا کریں اور اُن کو مربوط بنائیں۔ منصوبے کی تکمیل کی ذمہ داری متعلقہ اضلاع کی منتخب انتظامیہ مقامی باشندوں کی خوش دلانہ تعاون سے ادا کرے۔ جناب پلیجو نے اِن تجاویز سے اِس شرط کے ساتھ اتفاق کیا کہ چھوٹی قومیتوں اور پسماندہ طبقات کے استحصال کرنے والے نظام کا بھی قلع قمع ہونا چاہیئے۔

رسول بخش پلیجو کا یہ دورہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اہل لاہور نے پہلی بار سندھی بولنے والوں کی شکایات کسی مقتدر رہنما کی زبان سے براہ راست سُنیں اور دیہی سندھ کے کسی رہنما نے پہلی بار جمہوری لاہور کی کشادہ ظرفی، سندھ کے مسائل سمجھنے کے لئے تجسس اور دلچسپی کا مثبت مظاہرہ دیکھا۔ رسول بخش پلیجو نے اِس صورت حال کو تسلی بخش پایا۔ اُنہوں نے اِس الزام کو رد کیا کہ پنجاب کے بیدار اور ترقی پسند طبقات سندھ یا دوسرے صوبوں کے حقوق اور مفادات پامال کرنے والوں کے ہمنوا ہیں۔ بعض حلقوں کی جانب سے سندھ کی علیحدگی کی جو بات کی جاتی ہے اِس بارے میں اُنہوں نے کہا کہ یہ گذرے ہوئے زمانے کی بات ہے۔ اُنہوں نے یقین دلایا کہ آئندہ دیہی سندھ میں جمہوریت پسند پنجاب کے بارے میں بہتر تصور اور رویہ اُبھرے گا۔ جس کے لئے وہ اپنا کردار ادا کریں گے۔

Annexure I

The Pakistan Resolution*

March 23, 1940

While approving and endorsing the action taken by the council and the working committee of the All India Muslim League, as indicated in their resolutions dated the 27th of August, 17th and 18th of September and 22nd of October 1939, and 3rd of February 1940 on the constitutional issue, this session of the All India Muslim League emphatically reiterates that the scheme of federation embodied in the Government of India Act, 1935, is totally unsuited to, and unworkable in the peculiar conditions of this country and is altogether unacceptable to Muslim India.

It further records its emphatic view that while the declaration dated the 18th of October 1939, made by the Viceroy on behalf of His Majesty's Government is reassuring in so far as it declares that the policy and plan on which the Government of India Act, 1935, is based will be reconsidered in consultation with the various parties, interests and communities in India, Muslim India will not be satisfied unless the whole constitutional plan is reconsidered *de novo* and that no revised plan would be acceptable to the Muslims unless it is framed with their approval and consent.

Resolved that it is the considered view of this session of the All India Muslim League that no constitutional plan would be workable in this country or acceptable to the Muslims unless it is designed on the following basic principle, viz. that geographically contiguous units are demarcated into region which should be so constituted, with such territorial readjustments as may be necessary, that the areas in which the Muslims are numerically in a majority as in the North-Western and Eastern zones of India should be grouped to constitute 'Independent

*Resolution of the All India Muslim League from December 1938 to March 1940, published by (Nawabzada) Liaquat Ali Khan, M. A. (Oxon), M.I A. (U.P.) Barrister-at-Law, Honorary Secretary, All India Muslim League, Delhi, pp. 47-48.

States in which the constituent units shall be autonomous and sovereign.

That adequate, effective and mandatory safeguards should be specifically provided in the constitution for minorities in these units and in the regions for the protection of their religious, cultural, economic, political, administrative and other rights and interests in consultation with them and in other parts of India where the Mussalmans are in a minority adequate, effective and mandatory safeguards shall be specifically provided in the constitution for them and other minorities for the protection of their religious, cultural, economic, political, administrative and other rights and interests in consultation with them.

This session further authorises the working committee to frame a scheme of constitution in accordance with these basic principles, providing for the assumption finally by the respective regions of all powers such as defence, external affairs, communications, customs and such other matters as may be necessary.

Annexure II

*Resolution of the Muslim League Legislators' Convention on the Pakistan Demand

April 9, 1946

Whereas, in this vast subcontinent of India, a hundred million Muslims are the adherents of a faith which regulates every department of their life (educational, social, economic and political), whose code is not confined merely to spiritual doctrines and tenets or rituals and ceremonies and which stands in sharp contrast to the exclusive nature of Hindu *dharma* and philosophy which has fostered and maintained for thousands of years a rigid caste system resulting in the degradation of 60 million human beings to the position of untouchables, creation of unnatural barriers between man and man and superimposition of social and economic inequalities on a large body of the people of this country, and which threatens to reduce Muslims, Christians and other minorities to the status of irredeemable helots, socially and economically ;

Whereas the Hindu caste system is a direct negation of nationalism, equality, democracy and all (the) noble ideas that Islam stands for ;

Whereas different historical backgrounds, traditions, cultures, social and economic orders of the Hindus and Muslims have made impossible the evolution of a single Indian nation inspired by common aspirations and ideals and whereas after centuries they still remain two distinct major nations ;

Whereas, soon after the introduction by the British of the policy of setting up political institutions in India on the lines of Western democracies based on majority rule, which meant that the majority of one nation or society could impose its will on the majority of the other nation or society in spite of their opposition, as was amply demonstrated during the two and

*Resolutions of the All India Muslim League from January 1944 to December 1946, published by Mr. Liaquat Ali Khan, M.A. (Oxon), Honorary Secretary, All India Muslim League, pp. 45–47.

a half years' regime of Congress Governments in the Hindu-majority provinces under the Government of India Act, 1935, when the Muslims were subjected to untold harrassment and oppression as a result of which they were convinced of the futility and ineffectiveness of the so-called safeguards provided in the Constitution and in the Instrument of Instructions to the Governors and were driven to the irresistible conclusion that in a united Indian federation, if established, the Muslims, even in majority provinces, would meet with better fate and their rights and interests could never be adequately protected against the perpetual Hindu majority at the centre;

Whereas the Muslims are convinced that with a view to saving Muslim India from the domination of the Hindus and in order to afford them full scope to develop themselves according to their genius, it is necessary to constitute a sovereign independent State, comprising Bengal and Assam in the North-East zone and the Punjab, North-West Frontier Province, Sind and Baluchistan in the North West zone ;

This convention of the Muslim League legislators of India central and provincial, after careful consideration hereby declares that the Muslim nation will never submit to any constitution for a united India and will never participate in any single constitution-making machinery set up for the purpose, and that any formula devised by the British Government for transferring power from the British to the peoples of India, which does not conform to the following just and equitable principles calculated to maintain internal peace and tranquillity in the country, will not contribute to the solution of the Indian problem;

1. That the zones comprising Bengal and Assam in the North-East and the Punjab, North-West Fronter Province, Sind and Baluchistan in the North-West of India, namely, Pakistan zones, where the Muslims are in a dominant majority, be constituted into a sovereign independent State and that an unequivocal undertaking be given to implement the establishment of Pakistan without delay ;

2. That two separate constitution-making bodies be set up by (the) peoples of Pakistan and Hindustan for the purpose of framing their respective constitutions;

3. That the minorities in Pakistan and Hindustan be provided with safeguards on the lines of the All-India Muslim League resolution passed on the 23rd of March 1940, at Lahore.

4. That the acceptance of the Muslim League demand of Pakistan and its implementation without delay are the *sine* qua non for the Muslim League co-operation and participation in the formation of an interim Government at the centre.

This convention further emphatically declares that any attempt to impose a constitution on a united India basis or to force any interim arrangement at the centre, contrary to the Muslim League demand, will leave the Muslims no alternative but to resist such imposition by all possible means for their survival and national existence.

Annexure III

*Resolution passed at the Sind Provincial Muslim League Conference, Karachi, 8-9th October, 1938.

Whereas the refusal on the part of the working committee of the Indian National Congress to negotiate a communal settlement with the All-India Muslim League, on the plea that the All-India Muslim League is not the sole representative body of the Mussalmans of India indicates the Congress resolve to perpetually divide and rule the Muslim community, and thus once more mar the prospects of an amicable and peaceful solution of the Indian minorities problem, for which the League has tried in vain for more than 15 years.

Whereas the Congress has by means of its powerful press and purse, launched a campaign of Muslim Mass Contact to cause disruption and division in the Muslim community with the object of deceiving the world into the belief that it is the sole representative organisation of entire India.

Whereas it has deliberately established purely Hindu rule in certain provinces by forming ministries either without Muslim ministers or with Muslim ministers having no following among Muslim members, in direct and flagrant violation of the letter and spirit of the Convention of India Act, 1935 and the Instrument of Instructions.

Whereas the ministries so formed have established a sort of rule which has for its aim the intimidation and demoralisation of Muslims, the extermination of the healthy and nation-building influences of Muslim culture, the suppression of Muslim religious customs and their religious obligations and elimination of their political rights as a separate community.

Whereas it has in open defiance of the democratic principles persistently endeavoured to render the power of the Muslim majorities ineffective and important in the North-Western Provinces, Bengal, the Punjab and Sind by trying to bring into

*Jamil-ud-din Ahmad

Historic documents of the Muslim Freedom Movement, Lahore, publishers United Ltd., 1970 pp. 255–258.

power or by supporting coalition ministries not enjoying the confidence of the majority of Muslim members and the Muslim masses of those provinces.

Whereas Congress has superimposed the authority of its High Command, a sort of fascist dictatorship, over the working of the Congress ministries to prevent the healthy growth of parliamentary conventions and establishment of constitutional traditions, to deprive the Muslims of their due share and have refused to reconstitute ministries in consonance with the constitution, having due regard to the rights and interests of Muslims.

Whereas the Congress has decided :

(a) to enforce Vidya Mandir Scheme in the teeth of Muslim opposition ;

(b) to foist the Bande Matram on Muslims and others as a national anthem in callous disregard of the feelings of Muslims who consider the song as not only idolatrous but it is in origin and conception a hymn of hatred to Muslims ;

(c) to make Hindi with Devangiri script as the Lingua Franca of India in total defiance of the protests and wishes of the minorities with a view to inculcating Hindu religious ideas, philosophy and culture and establish dominance of Brahmanic culture in India ;

(d) to introduce and enforce joint electroates in local bodies with the strength of their majority and thus deprive Muslims of securing their true representation;

(e) to close Urdu schools wherever possible and discourage the teaching of the Urdu language, and thus ultimately wipe it off ;

(f) to suppress freedom of press and freedom of speech and legitimate action under the pretext of preventing incitement to violence and maintenance of law and order ;

(g) to interfere with the age-long religious privileges and usages of the Muslim community by force of arm and resort to repressive measures.

Whereas the majority community of India has fostered and maintained since thousands of years a rigid caste system of theirs which is a negation of nationalism, equality, democracy and all the noble ideals that the modern world aspires to and stands for and which system has furher superimposed social and economic inequalities upon a vast body of the people of this country and reduced millions of them to the position of irredeemable helots.

And whereas the evolution of a single united India and united Indian nation inspired by common aspirations and common ideals being impossible of realisation on account of the caste-ridden mentality and anti-Muslim policy of the majority community, and also on account of acute differences of religion, language, script, culture, social laws and outlook on life of the two major communities and even of race in certain parts.

This conference considers it absolutely essential in the interests of an abiding peace of the vast Indian continent and in the interests of unhampered cultural development, the economic and social betterment, and political self-determination of the two nations known as Hindus and Muslims, to recommend to All-India Muslim League to review and revise the entire question of what should be the suitable constitution for India which will secure honourable and legitimate status due to them, and that this conference, therefore, recommends to the All-India Muslim League to devise a scheme of constitution under which Muslims may attain full independence.

Further this conference records its emphatic disapproval of the scheme of the All-India federation as embodied in the Government of India Act, 1935, and is opposed to its introduction and urges upon the British government to refrain from its enforcement as it considers the scheme to be detrimental to the interests of the people of India generally and those of the Muslims in particular.

That this conference further declares that no constitution by whomsoever framed will be acceptable to the Muslims of India unless it conforms to the principle enunciated above and is prepared in consultation with and accepted by the All-India Muslim League.

Annexure IV

Foundation Document of the Movement for Restoration of Democracy (MRD).

Declaration
(February 1981)

Despite the divergence in our political complexion, we the signatory parties to this declaration, feel it our moral duty and national obligation to apprise the nation of the gravity of the situation undergoing the very existence of the federation of Pakistan. Pakistan and martial law cannot coexist. An earlier martial law, under General Yahya Khan, resulted in secession of East Pakistan. The martial law of Zia-ul-Haq today threatens once again the existence of the federation of Pakistan. This crisis of colossal magnitude can only be met with the united will and support of the entire country, mobilised by a popularly elected government.

We, therefore demand that Zia-ul-Haq quit and martial law be lifted immediately failing which they will be removed by the irresistible will of the people; that free, fair and impartial elections to the National and Provincial Assemblies be held within 3 months, in accordance with the unanimously adopted Constitution of 1973, and power be transferred to the elected representatives of the people; and the interests of the four federating units be fully restored and protected.

Annexure V

THE MRD PARTIES AS IN MAY 1986

	Party	Leader
1.	Awami Tehrik	Mr. Fazal Rahu
2.	Jamiat Ulma-i-Islam (JUI)	Maulana Hamid Mian
3.	Mazdoor Kisan Party	Mr. Fatehyab Ali Khan
4.	National Democratic Party (NDP)	Khan Abdul Wali Khan
5.	Pakhtoon Khaw NAP	Mr. Mahmood Khan Achakzai
6.	Pakistan Democratic Party (PDP)	Nawabzada Nasrullah Khan
7.	Pakistan Muslim League	Khawaja Khair-ud-Din
8.	Pakistan National Party (PNP)	Mir Ghaus Bakhsh Bizenjo
9.	Pakistan Peoples Party (PPP)	Miss Benazir Bhutto
10.	Qaumi Muhaz-i-Azadi	Mr. Meraj Muhammad Khan
11.	Tehrik-i-Istiqlal	Retd Air Marshal Mohammad Asghar Khan